حَامِدًا وَّمُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

مقدمہ

قلم را آں زباں نبود کہ سرِّ عشق گوید باز
بروں از حدِّ تقریر است، شرحِ آرزومندی

ستمبر ۱۹۴۲ء کے دوسرے ہفتہ کا ذکر ہے۔ میں حسب معمول، نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا الحاج محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی دامت معالیہ کی خدمت میں جیب گنج حاضر ہوا۔ تو موصوف نے قدیم شفقتِ بزرگانہ کے تحت کلکتہ سے آیا ہوا ایک خط دکھایا۔ میں اسی سال اجمیر شریف سے "فارغ عن التحصیل" ہو کر حضرت الاستاذ علامۃ الہند مولانا محمد معین الدین الاجمیری کی وفات حسرت آیات کے بعد، خاندانی دار العلوم مدرسہ حافظیہ سعیدیہ دادوں ضلع علیگڈھ میں (جو حبیب گنج سے دو میل

پر واقع ہے) مدرس ہوا تھا۔

نواب صاحب نے علامہ طیبی المتوفی ۷۴۳ھ مطابق ۱۳۴۲ء کی شرح مشکوٰۃ[ا] کے دو کرم خوردہ قلمی نسخے اپنے مشہور کتاب خانہ کے لئے حاصل کئے تھے۔ کتاب کی اہمیت اور نایابی کی بنا پر مفتی عبداللطیف صاحب صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

[ا] ملا علی قاری نے مرقات شرح مشکوٰۃ اور مولانا شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے لمعات و اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ میں اور دوسرے شارحین حدیث نے جابجا طیبی کا حوالہ دیا ہے۔ محققانہ و فقیہانہ انداز میں لکھی گئی ہے۔ اس کی چار جلدیں ہیں۔ تقریباً دو ہزار صفحات ہیں۔ میں نے دو سال کے اندر اپنی درسی و خانگی مصروفیات کے باوجود برادر عزیز مولوی محمد زاہد خاں شروانی سلمہٗ کی مدد سے پوری کتاب نقل کر کے مقابلہ کر ڈالا۔ ناظم کتاب خانہ مولوی معین الدین افضل گڑھی نے بھی مقابلہ میں عرق ریزی سے کام لیا۔ اس کے نسخے خدابخش لائبریری پٹنہ، فتح پوری دہلی، کتاب خانہ قاضی رام پور میں موجود ہیں۔ صحیح اور قریب العہد نسخہ رام پور کا ہے۔ جو کوششوں کے باوجود مقابلہ کے لئے حاصل نہ ہو سکا۔ فتح پوری دہلی کا نسخہ ملا۔ بدخطی اور اغلاط سے پر ہے۔ نواب صاحب کا ارادہ مصر میں چھپوانے کا تھا جو جنگ کی دشواریوں کی وجہ سے معرض التوا میں پڑ گیا۔ سہولتیں ملنے پر اولین فرصت میں اشاعت کا انتظام کیا جائے گا۔

شاہد شروانی

کا نسخہ منگا کر ناظم کتاب خانہ سے اس کی نقل کرا رہے تھے مجھے بھی اس کی نقل کا اشتیاق ہوا۔ پہلے تو پس و پیش فرمایا، آخر کار میری بار بار کی گذارش پر اجازت مرحمت فرمائی، میں ہر ہفتے جمعہ کو مدرسہ کی چھٹی کے دن جا کر نقل شدہ اجزاء کتاب داخل کر کے دوسرے لے آتا۔ اسی سلسلے میں ہر ہفتے کتاب خانہ اور صاحب کتاب خانہ کی زیارت کا موقع ملتا۔

جب وہ کلکتہ سے آیا ہوا خط دیکھا تو کیا عرض کروں دل پر کیا گذری، ایک بار نہیں بار بار پڑھا۔ ہر بار نیا کیف و سرور حاصل ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے اس محبت نامہ مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۴۷ء میں الفاظ نہ تھے بلکہ موتی تھے جو سلک سطور میں پروئے گئے تھے۔ دل کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو صفحۂ کاغذ پر، تصورِ صحبتِ گذشتہ سے متاثر ہو کر اکٹھا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

شاید ان ذرّوں میں تصویریں کھنچی ہوں آپ کی
یہ سمجھ کر منتشر اجزاءِ دل، یک جا کئے

لکھنے والے کا انداز بتا رہا تھا کہ کسی کی اچانک یاد نے دل تڑپا دیا ہے۔ اور قلم برداشتہ دل کی بے قید اور "آزاد" صداؤں کو گوشِ "حبیب" تک پہونچانے کی سعی کی ہے۔ بینے اس نامۂ گرامی کے نقل کی بتوسط ماسٹر سید منظہر علیم استدعا کی جو منظور ہوئی۔ جب نامہ و پیام کا سلسلہ جاری ہوگیا تو "مراسلتِ حبیبین" کے نام سے فائل بنا لیا گیا اور ماسٹر صاحب مرحوم کے زیرِ نگرانی زینتِ کتاب خانہ بنا ہیں ۲۷ ستمبر ۱۹۴۵ء کو مولانا آزاد کی طلب پر جب دہلی حاضرِ خدمت ہوا اور "غبارِ خاطر" کی اشاعت کا تذکرہ آیا تو میں نے خطوطِ قبل نظر بندی کے شمول کی بھی آرزو ظاہر کی اور ارشاد گرامی کے مطابق وہ سب مکاتیب نواب صاحب کی منظوری اور تصدیقی دستخط ثبت کرا کے بالترتیب نقل کرکے خدمت والا میں روانہ کر دیئے کسی مصلحت کی بنا پر وہ خطوط شاملِ غبارِ خاطر نہ ہوسکے۔ ان مکاتیب میں علمی، ادبی اور تاریخی معلومات کا بے بہا ذخیرہ تھا۔ اہل علم و ادب کو اس مجموعہ سے محروم دیکھ کر کفِ افسوس ملنا پڑا۔

منتظر موقع تھا کہ دونوں بزرگوں سے گذارش کر کے منصّہٴ
شہود پر لانے کی کوشش کروں کہ رفیق محترم سید الطاف علی
بریلوی سپرنٹنڈنٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے
جبیب گنج پہونچ کر "السّابقون الاوّلون" کا درجہ حاصل کر لیا۔
نہ صرف اہل علم وادب بلکہ کانفرنس کے شکریہ کے مستحق بھی ٹھیرے
کیونکہ اس کے حقوقِ منفعت کانفرنس کے لئے محفوظ کرائے۔
سید صاحب سے کئی بار اس مراسلت کا ذکر آچکا تھا۔ غالب
نے شاید اسی موقع کے لئے یہ شعر کہا تھا:-

ذکر اُس پریوش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

مجھ پر ان دونوں گرامی قدر ہستیوں کی شفقت و توجہ کا
حال موصوف کو اچھی طرح معلوم تھا ہی۔ اس مجموعہٴ خطوط کا
جسے اب "کاروانِ خیال" کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے۔
دیباچہ لکھنے کی پیش کش کی۔
ملک کے دو مسلّم الثبوت ادیب، بے مثال انشا پرداز،

یگانۂ روزگار فاضل، اور صفِ اوّل کے مشاہیر کی تحاریر پر قلم اُٹھانا بڑی دیدہ دلیری اور جرأت کا کام تھا۔ ہوش نے ہمت شکنی، اور شوق نے حوصلہ افزائی کی۔ ہوش و شوق کی اس کش مکش نے انسانِ ظلوم و جہول کے ازل میں بارِ امانت اُٹھانے کا واقعہ یاد دلایا۔ جس کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"اِنّا عرضنا الامانۃ علی السمٰوات والارض والجبال فابین ان یحملنہا واشفقن منہا وحملہا الانسان انہٗ کان ظلوماً جہولاً"

جب اس بارِ عظیم (خلافت الٰہی) کو غافل انسان نے اُٹھالیا جس کا نام سن کر آسمان کو لرزہ اور زمین کو زلزلہ آگیا تھا۔ سمندر کپکپانے اور پہاڑ تھرتھرانے لگے تھے تو اسی نوع انسانی کا ایک فرد ہو کر ہمت ہار جانا دیرینہ روایات کے سراسر خلاف تھا۔ یہ دونوں باکمال بزرگ تقریباً نصف صدی سے مشاہیر ہند میں شمار ہوتے ہیں۔ دونوں میں "عام

خاص من وجہ" کی نسبت ہے۔ دو مادۂ افتراق اور ایک مادۂ
اجتماع پایا جاتا ہے۔ جہادِ حریت میں ایک ہمہ سر پیکار اور انتظام
امور ریاست میں دوسرا سرگرم کار۔ بقاء شانِ اسلاف یعنی
پابندئ وضع و تہذیبِ اسلامی اور ذوقِ علم تاریخ و ادب
میں دونوں متحد، ذوق کی یک جہتی نے مادۂ اجتماع کو افتراق
پر غالب کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۰۵ء کی پہلی ملاقاتِ
لکھنؤ کے بعد دونوں کے تعلقات میں رابطہ اور رابطہ میں
استواری پیدا ہوتی رہی۔ ایک نے حیدر آباد جا کر مسند صدارت
امور شرعیہ سنبھالی اور دوسرے نے رانچی (بہار) کو ایام
نظر بندی اور سرکاری مہمان خانوں کو زمانۂ اسیری میں پہونچکر
آباد کیا، راہوں کے اس بعد المشرقین نے بھی ذوق کی یکسانی
میں فرق نہ آنے دیا اور اس چالیس سال کی مدت میں خلاص
و مودت نے۔

اتحادیست میانِ من و تو　　　من و تو نیست میانِ من و تو

کی شکل اختیار کر لی، "غبار خاطر" اسی کی ایک جھلک اور کاروانِ خیال

اُسی کا دوسرا پرتو ہے۔

نواب صدر یار جنگ بہادر کے متعلق مجلّہ مصنّف علی گڈھ جنوری ۱۹۴۶ئ میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں اور بہت کچھ لکھنا باقی ہو۔ خدا نے موصوف کو بڑی صلاحیتوں کا مالک بنایا ہو۔ عزّت وعظمت، دولت وریاست، جاہ وحشم، اور علم وفضل کی نعمتوں سے سرفراز اور معاصرین میں یک گونہ ممتاز ہیں۔ آپ کا جمع کردہ نادرالوجود کتب خانہ ہندوستان کے معدودے چند مشہور کتب خانوں میں سے ایک ہے۔ ہند و بیرونِ ہند کے فضلاء آ آکر استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ جرمنی و بغداد وغیرہما کو کتابیں مقابلے کے لئے جاتی رہتی ہیں۔ بیسیوں کتابوں کے مؤلّف اور کئی مفید تصانیف کے مصنّف ہیں علمی و تاریخی مقالات مطبوعہ وغیر مطبوعہ کا مجموعہ پریس میں پہونچ چکا ہے، دیوان فارسی و اردو مرتب ہو چکے ہیں۔ اسّی سال سے متجاوز سن ہے مگر تقریر و تحریر میں وہی شگفتگی و شوخی ہے۔ جادۂ ادب کے پُرانے سالک اور مخصوص طرز

نگارش کے مالک ہیں۔ نظم کی طرح نثر میں بھی شاعری فرمالیتے ہیں ۱۳۱۴ھ میں اپنی تصنیف "علمائے سلف" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"شوال ۱۳۱۱ھ کا ذکر ہے کہ ندوۃ العلماء کا اوّل اجلاس شہر کانپور میں منعقد ہوا تھا جس میں دیار ہند کے اکثر مشاہیر علماء رونق افروز تھے۔ بزم ان کے جمالِ کمال سے روشن تھی اور نگاہ ان کے کمالِ جمال سے منور۔"

خط کشیدہ جملہ بار بار پڑھئے، اور سر دھنئے۔ پورے پچاس سال قبل کا جملہ ملاحظہ فرمالیا اب حال کا فقرہ یا اسّی سالہ زندگی کا تجربہ و حاصل بھی معائنہ کرتے چلئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو جواب مکتوب مذکور میں تحریر فرماتے ہیں۔

"خلوص سدا بہار ہے اور اس ہنگامۂ ہستی میں یہی ایک نعمت ابدی ہے۔"

اس جملۂ حق کی شرح، دلِ دردمند آزاد سے پوچھئے۔ ۲۹ ستمبر ۱۹۴۰ء کے خط میں صفحے کے صفحے رنگین کر ڈالے ہیں۔ نواب صاحب

کی ادبی عظمت کے لئے یہی کافی ہے کہ سارے ملک میں آزاد کی مخصوص علمی و ادبی مخاطبت و مراسلت کے لئے اب موصوف ہی کی ذات رہ گئی ہے۔ فرصت کے لمحے اور تنہائی کی گھڑیاں ان ہی سے مخاطبت میں صرف ہوتی ہیں اور علامہ ڈاکٹر سید سلیمان ندوی جیسے فاضل یگانہ تک کو رشک ہوتا ہے کہ ان خطوط مودت کے "مخاطب تنہا" صدیق مکرم حبیب الرحمٰن خاں شروانی ہیں........"[۱]

پچھلی مرتبہ مارچ ۴۶ء میں یو۔پی وزارت کی تشکیل کے سلسلے میں لکھنؤ پہونچنے اور نواب صاحب کے ورود بلدہ کی اطلاع ملنے پر جائے قیام پر پہونچ کر والہانہ انداز میں بغل گیر ہوئے۔ مختصر مگر پُر لطف صحبت رہی، مشغولیتِ کار اور ہجوم افکار کے باوجود ملاقات کا موقع استاد ذوق کے ارشاد کے مُطابق نکال ہی لیا :۔

اے ذوقؔ کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

[۱] معارف بابت جون ۴۶ء صفحہ ۴۰۳۔

اس ملاقات کا ذکر نواب صاحب نے آخری خط میں کس مزے سے کیا ہے۔ دوبارہ ملنے کی سعیٔ ناکام پر کیسے حسرت آمیز فقرے لکھے ہیں۔

"غبار خاطر" نے دونوں کے تعلقات سے خاص و عام کو کافی روشناس کر دیا ہے۔

مدت کے بعد مولانا کے قلم کی گلکاریاں نظر نواز ہوئی تھیں، مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ مئی کے شروع میں پانچ ہزار کی تعداد میں یہ مجموعۂ مکاتیب چھپا۔ اور آخر ماہ تک ختم ہو گیا۔ پیہم طلب پر دوسرا ایڈیشن اتنا ہی تیار ہوا جو قریب ختم ہے۔

مولانا کے سینکڑوں مضامین و خطوط نظر سے گذرے میری علمی تہی مائگی اور ادبی بے بضاعتی آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ کون سا مضمون یا خط فصاحت و بلاغت، روانی و سلاست میں دوسروں سے فوقیت رکھتا ہے، شادی و مسرت کا موقع ہو یا حزن و الم کا، عیش و عشرت کے سامان مہیا ہوں یا رنج و غم

کے، تبریک و تہنیت کا محل ہو یا تعزیت و عیادت کا، ہر جگہ اشہبِ قلم یکساں دوڑتا نظر آئے گا۔ گویا نگاہوں کے سامنے وسیع میدانِ ادب ہے۔ رخشِ خامہ کو جدھر مہمیز لگا دی ہوا ہو گیا۔

یوں تو آزاد کی ہر تصنیف و مضمون میں ادبی شان پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے لیکن مجموعۂ خطوط "غبارِ خاطر" کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مردِ مجاہد کو سیفِ زبان و بیان پر کس قدر قدرت حاصل ہے۔ الفاظ کی قطع و برید، حروف کی تراش خراش دیکھکر بے ساختہ کہنا پڑتا ہے:

زکدام باغ اے گل کہ چنیں خوش است بویت

الفاظ فصاحت کے سانچہ میں ڈھلتے جا رہے ہیں اور خاتم عبارت میں نگیں بن کر جڑتے جا رہے ہیں۔

جب انسان میں کوئی کمال پیدا ہو جاتا ہے تو اس کا صدور و ظہور بلا قصد و ارادہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ آپ نے ہارمونیم اور ستار بجانے والے کو دیکھا ہو گا اس کی نظر کسی سمت ہو۔

خیالات غزل سرائی کی جانب متوجہ ہوں یا سامعین کی طرف آنکھوں پر پٹی بندھی ہو یا کھلی ہوں، انگلیاں اپنا کام اسی شان سے کرتی نظر آئیں گی۔ کیا مجال ہے جو کسی دوسرے تار یا سُر پر انگلی جا پڑے۔

مولانا کی نثر نگاری بھی کمال کے اُسی مرتبۂ اعلیٰ پر پہنچ چکی ہے۔ گرد و پیش کے حالات اور خطرناک و سنگین حادثات بھی متاثر نہیں کرسکتے۔ خود "غبار خاطر" اسی کی آئینہ دار ہے ۱۹۴۲ء کا پُر آشوب زمانہ ہے جرمنی سے ۱۹۳۹ء میں جنگ چھڑ چکی ہے یہ جنگ فیصلہ کُن جنگ ہے یورپ کے دو مختلف سیاسی اصولوں کی لڑائی ہے۔ آمریت اور نام نہاد جمہوریت کا سخت مقابلہ ہے۔ برطانیہ کو تباہی و بربادی کا منظر نظر آرہا ہے۔ ہندوستان صدیوں سے برطانوی شہنشاہیت کا غلام ہے پچاسی سال سے مسلسل جدّ و جہد آزادی جاری ہے۔ ہندوستان کی تمام آزادی خواہ جماعتوں نے اس جنگ کو سرمایہ داری کی جنگ بتا کر باشندگانِ ملک کو الگ رہنے کی اپیل کی ہے۔ ان کا

کہنا تھا کہ ہندوستان کو اس کی مرضی کے خلاف، آزادی کا وعدہ کئے بغیر جنگ میں نہیں گھسیٹا جا سکتا۔ ظاہر ہے حکومتِ وقت اس قسم کے باغیانہ نعرے کو ایسے نازک حالات میں کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ مختلف جماعتوں کو خلافِ قانون قرار دیا گیا۔ ان کے رہنماؤں اور سرگرم کارکنوں کو گرفتار کرکے لمبی لمبی سزائیں دی گئیں۔ ۹ اگست ۴۲ء کی شب کو کانگرس کے سارے قائدین اچانک گرفتار کر لئے گئے۔ بمبئی کو ساری دنیا سے بے تعلق کر دیا گیا۔ ٹیلیفون کے تار کاٹ دیئے گئے تاکہ باہر اطلاع نہ جا سکے۔ کانگریسی رہنماؤں کی اسپیشل سخت فوجی نگرانی میں ۸ بجے صبح کو کسی نامعلوم مقام کو روانہ ہو گئی۔ پورا ہندوستان امید و بیم کی حالت میں تھا۔ دونوں کی ضد نے ملک کو جہنم کدہ بنا دیا تھا، ان رہنماؤں کے متعلق یہ خیال ہو چلا تھا کہ بغاوت کا مقدمہ قایم کرکے پھانسی یا کم از کم عمر قید کی سزا ضرور ہوگی۔ خود رہنما بھی کسی طرح اپنے متعلق مطمئن نہ تھے۔

ان ہی اسیرانِ فرنگ میں طریقۂ یوسفی کا تابع اور سنّت شعب ابی طالب کا متبع، انڈین نیشنل کانگریس کا صدر، اور آسمان علم و ادب کا بدر، ابو الکلام آزاد بھی تھا۔ خود بیمار۔ شریکِ حیات مسلسل گرفتارِ مرض و آزار، اس پر پیہم شب بیداری اور ہجوم افکار، قلعۂ احمد نگر میں فوجی پہروں میں مقید و محبوس کر دیا جاتا ہے۔ چوبیس گھنٹوں کے بعد تھوڑا سا سکون ملنے پر نواب صاحب کو مخاطب بنا کر

"کس بشنود یا نشنود من گفتگوئے میکنم"

کا سلسلہ شروع کر دیا جاتا ہے۔

اب "غبار خاطر" کے ان خطوط پر نظر ڈالیے۔

قلعۂ احمد نگر کی تاریخی حیثیت کا بیان ہو یا گرفتاری کی روداد چینی چار نوشی کا پُر سرور تذکرہ ہو یا اس کے ختم ہو جانے کا فسانۂ غم، شریکِ حیات کا نوحۂ ماتم ہو یا دردِ فراق کا قصۂ الم، چڑے چڑیا کی کہانی ہو یا قلعہ کی شکستہ و کہنہ قبر کی داستانِ حسرت و ویرانی، گلہائے چمن کا ذکرِ زینت آرائی ہو یا بلبلان

گلشن کی کیفیتِ نغمہ سرائی، خدا کی وحدانیت پر دلائل قاطعہ پیش کئے جا رہے ہوں۔ یا پھولوں کی خلقت پر براہین ساطعہ، سب میں اعجاز نگاری کارفرما نظر آئے گی۔

پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیٔ گفتار
رکھدے کوئی پیمانہ وصہبا مرے آگے

وہ اہل علم حضرات جنھیں آزاد کے سیاسی مسلک سے اختلاف رہا ہے۔ جن میں مقتدر علما اور محترم پروفیسران کا گروہ بھی شامل ہے انھیں بھی "غبار خاطر" پر سر دھنتے دیکھا ہے، وہ بھی آزاد کی علمی قابلیت اور ادبی صلاحیت پر معتقدین ومخلصین کی طرح ایمان رکھتے ہیں۔

والفضل ما شھدت بہ الاعداءُ

وہ وقت بھی آرہا ہے جب تاریخ بتائے گی کہ یونان کا سقراط۔ حران کا ابن تیمیہ۔ افغانستان کا جمال الدین۔ اور مصر کا محمد عبدہ اور جوہری طنطاوی، ہندوستان میں بھی ابوالکلام آزاد کی شکل میں نمودار ہوا تھا۔

ماشئت قُلْ فیہ فانت مصدق

وَالفضل یقضی وَالمحاسن تشہد

یا آسان طریقہ پر " با توچہ گویم کہ تو مجنوں نہ " کے اصُول پر یوں سمجھیے :-

معشوق را بدیدۂ عشاق بنگرید

حسنِ گلاں بہ چشمِ عنادل سپردہ اند

جس نے آزاد کو دیکھ پایا ہے۔ اُسے یہی کہتے سنا ہے۔

" ایک بار دیکھا ہے اور دوبارہ دیکھنے کی آرزو ہے "

بقول مصحفی :- ترا شوقِ دیدار پیدا ہوا ہے

پھر اس دل کو آزار پیدا ہوا ہے

ہر ملاقات کے بعد خود اپنا یہ حال رہا ہے :-

از درِ دوست چہ گویم بچہ عنواں رفتم

ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

۲۷ ستمبر ۱۹۴۵ء سے ۲۲ ستمبر ۱۹۴۶ء تک ایک سال کا عرصہ ہوتا ہے ۔ سیاسی ہنگاموں کی بنا پر مولانا کا قیام ہر پھر کے دہلی

ہی رہا۔ چھ مرتبہ زیارت کا موقع ملا۔ خدا شاہد ہے دہلی تک شدِّ رحال کا مقصد ملاقات کے سوا کچھ نہ تھا۔ تین ملاقاتوں میں تفصیل سے گفتگو کا موقع مل سکا اور تین میں ہجوم اشغال کی بنا پر صرف سرسری سلام و دعا کی نوبت آسکی۔

۱۸ جنوری ۴۶ء کو ۹ بجے صبح جناب عبدالمجید خواجہ بیرسٹر، صدر آل انڈیا مسلم مجلس کے ساتھ حاضری ہوئی تو تقریباً پچاس موٹر اور بیسیوں تانگے کوٹھی کے دروازے پر کھڑے تھے۔ ملاقاتیوں کا ہجوم کوٹھی کو گھیرے ہوئے تھا۔ یہ الیکشن کا زمانہ تھا۔ تمام صوبوں کا تاریخی انتخاب سامنے تھا۔ اطلاع پہونچنے پر طلبی ہوئی۔ پنجاب کے ایک صاحب ریش بزرگ الیکشن کے مسئلے پر بار بار سوالات کئے جارہے تھے۔ نازک مزاجی متحمل نہ ہوسکی۔ عتاب کا انداز دیدنی تھا۔

"بگڑنے پہ بھی زلف اُس کی بنا کی"

اپنی خوش نصیبی پر جتنا فخر کروں کم ہے کہ خدا نے یہ رنگ بھی دکھادیا۔

جی چاہتا ہے پھر انھیں اک دن خفا کریں
جی چاہتا ہے پھر انھیں دیکھیں عتاب میں

ہلالی نے محبوب کے دونوں انداز کس خوبی سے دکھائے ہیں:-

گاہ آتش گاہ گل رخسارۂ جانانِ من
گل برائے دیگراں آتش برائے جانِ من

مگر یہاں معاملہ برعکس تھا۔ کاش ان بزرگ کی بجائے غصّہ میری قسمت میں آتا۔

دیکھ کر خندہ پیشانی سے حسب دستور سابق پیش آئے۔ مختصر صحبت رہی میں نے خود جلد ہی اجازت حاصل کرلی اور واپس چلا آیا۔ فرصت ملنے پر کچھ خیال آیا اور حسب ذیل گرامی نامہ نے سرفراز فرمایا:-

دہلی۔ ۳۱ر جنوری ۴۶ء

عزیزی۔ آپ اس روز آئے اور میں اس درجہ مشغول اور بے کیف تھا کہ کچھ دیر بیٹھ کر آپ سے باتیں بھی نہ کرسکا۔ اسے میرے تغافل پر محمول نہ کیجیے گا۔ آپ کی محبت و اخلاص کی وجہ

سے میں آپ کو عزیز رکھتا ہوں۔ اور معاملہ رسوم وظواہر سے گذر چکا ہے۔ والسّلام علیکم

ابوالکلام

سرفراز ناموں نے پہلے بھی مشرف فرمایا تھا مگر اس نامۂ گرامی نے بہت متاثر کیا بے ساختہ زبان پر سرمد علیہ الرحمۃ کی رُباعی آگئی:۔

ہر جا کہ روی مہر ووفا یارِ تو باد　　آرام وفراغت ہمہ جا یارِ تو باد
از نامہ وُ پیغام فراموش مکن　　یا د آوریم بکن۔ خدا یارِ تو باد

۲۷ ستمبر ۴۵ء کی ملاقات کافی طویل رہی۔ لمبے اجلاسوں سے کچھ وقفہ ملا تھا کہ ——— میں بلائے ناگہانی بن گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی ہم نفس کی تلاش پہلے ہی سے تھی۔

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

علماء وصلحاء کا تذکرہ، تاریخی واقعات، علمی مشاہدات عملی تجربات، اور ادبی وفنی نکات کا دفتر کھل گیا منہ سے پھول

جھڑنے لگے :-

ہر غنچہ کہ گل گشت دگر غنچہ نہ گردد
قربان زلبِ یار گہے غنچہ گہے گل

یا یوں کہہ لیجئے :-

تیرے نازک لبوں سے سیکھا ہے
غنچہ انداز مسکرانے کا

ادھر یہ عالم تھا :-

ایک بجلی سی تڑپ جاتی تھی ہر جنبش کے ساتھ
درد بھی دل میں باندازِ نگاہِ یار تھا

گفتگو کا انداز، نگاہوں کی کیفیت، افہام و تفہیم کا طرز، کس کس چیز کا نقشہ کھینچوں اور پھر!

گر مصوّر صورتِ آں دلستاں خواہد کشید
حیرتے دارم کہ نازش راچساں خواہد کشید

میں محوِ حیرت بنا ہوا سوچتا ہی رہا :-

ہر ایک عنوانِ دردِ فرقت۔ ہے ابتدا شرحِ مدّعا کی
کوئی بتائے کہ یہ فسانہ سنائیں انکو کہاں سے پہلے

پھر میں کہتا بھی تو کیا کہتا۔

کب میری ہر نگاہ سے اُن پر عیاں نہ تھا
وہ مُدّعا جو تابعِ لفظ و بیاں نہ تھا

اور مجھے کچھ کہنے کی ضرورت بھی کب باقی رہی تھی بقول غالب

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

چوتھی ملاقات ۱۵ر جون ۴۶ء کو ہوئی۔ وزارتی مشن سے روزانہ سابقہ، گفت و شنید، ورکنگ کمیٹی کے بلاناغہ اجلاس، اوقاتِ فرصت کی قلّت، اشغال کی کثرت، ان تمام باتوں کے باوجود زیارت کی نوبت آئی، علمی و ادبی تذکرے چھڑے۔ والہ داغستانی کے تذکرہ ریاض الشعراء اور علامہ فضل حق خیرآبادی کے رسالہ روض المجود کی حیثیت کا بیان۔ مولانا معین الدین اجمیری مرحوم وغیرہ کا ذکر خیر۔ نواب صدیار جنگ

بہادر سے ملاقات لکھنؤ کی کیفیت، اسی قسم کی باتیں رہیں۔
کئی گھنٹے تک ان ہی تذکروں سے مشام مجلس معطّر اور بزم
سخن منوّر رہی۔ اور اپنا یہ حال رہا:

بہ حرفے مے تواں گفتن تمنّائے جہاں را
من از ذوقِ حضوری طول دادم داستانی را

پنڈت جواہر لال نہرو دو مرتبہ جھانک کر واپس گئے۔ پروفیسر
رنگا جو یورپ سے کسانوں کی کانفرنس میں شرکت کر کے لوٹے
تھے مشتاق ملاقات تھے۔ مولوی اجمل خاں صاحب کی اجازت
طلبی پر انتظار کا حکم ملا۔ شیخ حسام الدین بی۔ اے امرت سری
صدر مجلس احرار اسلام ہند، اور مسٹر ایس۔ اے بخاری ڈائریکٹر
جنرلِ آل انڈیا ریڈیو دہلی کی موجودگی بھی پُر لطف و باکیف
گفتگو میں حارج نہ ہوئی۔ گویا کچھ دیر کے لئے دوسرے ہی عالم
میں پہونچ چکے تھے۔ ہنگامی دنیا سے کوئی علاقہ ہی نہ رہا تھا۔
"غبارِ خاطر" کے دیباچہ میں اجمل صاحب نے کتنا صحیح لکھا
ہے:

"مولانا کی سیاسی زندگی کے طوفانی حوادث ان کی تمام دوسری حیثیتوں پر چھا گئے ہیں لیکن خود مولانا نے اپنی سیاسی زندگی کو اپنے علمی اور ادبی علائق سے بالکل الگ رکھا ہے۔...... ایک بے خبر آدمی اگر اس وقت کی باتوں کو سنے تو خیال کرے کہ اس شخص کو سیاسی دنیا سے دور کا بھی علاقہ نہیں ہے اور علم و ادب کے سوا اور کسی ذوق سے آشنا نہیں........ وہ اس وقت اپنی یکساں اور بے کیف سیاسی مشغولیت کا مزہ بدلنے کے لئے کوئی ایسا موضوع چھیڑ دیں گے جو سیاسی زندگی کے میدانوں سے ہزاروں کوس دور ہوگا۔ علم و فن کا کوئی مبحث، فلسفیانہ غور و فکر کی کوئی کاوش، طبعیات کا کوئی نیا نظریہ، تصوف و اشراق کا کوئی وارده، یا پھر ادب و انشاء کی سخن طرازی اور شعر و سخن کی بزم آرائی، غرضکہ سیاست کے سوا ہر ذوق کی وہاں گنجائش ہوگی، ہر وادی کی وہاں پیمائش کی جا سکے گی۔ اس وقت کوئی انھیں دیکھے تو صاف دکھائی دے کہ زبان حال سے خواجہ حافظ کا یہ شعر دہرا رہے ہیں :-

کمند صید بہرامی بیفگن، جام مے بردار
کہ من پیمودم ایں صحرا، نہ بہرام است ونے گورش"

مولوی اجمل خاں صاحب نے تو آٹھ سال کا تجربہ لکھا ہے اور مجھے زندگی کے چند خوش گوار لمحوں نے ہی اس کی تصدیق کرادی۔ میں نے "غبار خاطر" کا وہ نسخہ جس پر نواب صاحب نے "ہدیہ" اور میرا نام لکھ کر اور اپنے دستخط مزیّن فرما کر از راہ قدردانی مجھے عنایت فرمایا تھا۔ مولانا کی خدمت میں دستخطوں کے لئے پیش کیا تاکہ دونوں بزرگوں کے دستخطوں کے بعد کچھ دن گذرنے پر تاریخی اہمیت کی چیز ہو جائے اور میرے مختصر کتاب خانے میں بعض دوسرے نوادر کے ساتھ ایک جنس گراں مایہ کا اور اضافہ ہوسکے۔ اپنی مہربانی سے نہ صرف دستخط فرمائے بلکہ یہ شعر بھی سرورق پر لکھ دیا :-

طبعے بہم رساں کہ بسازی بعالمے
یا ہمتے کہ از سرِ عالم تواں گذشت

مولانا کی ساری زندگی مصرعِ ثانی کی حامل رہی۔ ابتدا ہی

سے ترقی کے اعلیٰ مدارج پر گام زن رہے خیال کی بلندی اور فکر
کی رفعت نے ہمیشہ مخلوق سے الگ شاہراہ بنوائی:-

تفاوت است میانِ شنیدنِ من و تو
تو بستن در و من فتحِ باب می شنوم

"کہتی ہے تجھکو خلقِ خدا غائبانہ کیا"

پر کبھی دھیان ہی نہ دیا۔ غائبانہ کا کیا ذکر "شاہدانہ" طور پر بھی
کب محفوظ رہے ہیں نے جگ بیتی کو چھوڑ کر آپ بیتی سرگذشت
سنا ڈالی حاشا خود ستائی مقصود نہیں۔ مقصد اس کے سوا کچھ
نہ تھا کہ مولانا کے اعلیٰ کردار اور بلند و بالا اخلاق سے روشناس
کر سکوں کہ جب میرے جیسے تہی مایہ انسان کے ساتھ یہ حسن سلوک
ہے تو اہل فضل و کمال اور رفقائے قدیم سے وسعت اخلاق کا
کیا حال ہوگا۔ اور مجھ جیسے ہیچ میرز کی حضوری پر بڑی بڑی
شخصیتوں کی موجودگی اثر انداز نہیں ہوسکتی اور التفات و شفقت
میں حارج نہیں بن سکتی تو کسی ہمدم دیرینہ کا ملجانا ملاقات خضرو
مسیحا سے بہتر کیوں نہ سمجھا جاتا ہوگا۔ اسی سے نواب صاحب

موصوف کے خصوصی تعلقات پر روشنی پڑتی ہے جو ہم ذوق ہونے کے علاوہ مولانا سے عمر میں تقریباً اتنے ہی بڑے ہیں جتنا کہ میں مولانا سے چھوٹا ہوں، خُردوں پر شفقت ہی سے بزرگوں کی عظمت و توقیر کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ "من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا فلیس منّا" افصح فصحاء العرب کا ارشاد گرامی ہے۔
یہ بھی عجیب اتفاق ہے اور زمانہ بخت و اتفاق سے بھرا پڑا ہے۔ خود بخت و اتفاق معرکۃ الآرا بحث ہے۔ فلاسفہ نے اس پر کافی طبع آزمائی کی ہے۔ خاتم الحکماء علامہ فضل حق خیرآبادی نے اپنی اہم ترین تصنیف حاشیۂ قاضی مبارک میں دوسرے مشہور مباحث کے ساتھ اس بحث کو بھی مستقل طور پر لکھا ہے۔
۱۵ر جون ۱۹۴۶ء کو چوتھی بار دہلی میں مولانا سے نیاز حاصل ہوا جس کی مختصر کیفیت درج کی جا چکی ہے۔ یہی سال گذشتہ ۱۹۴۵ء کی وہ تاریخ تھی جس میں مولانا نے دوسرے رفقاء کار کے ساتھ قید فرنگ سے نجات حاصل کی، اور یہی سال گذشتہ کی وہ تاریخ تھی جس میں میری مکمل تباہی و بربادی کی گئی تھی۔

اسی کو اتفاق کہتے ہیں۔اس موقع پر بھی مولانا ہی کے تسکین دہ الفاظ نے زخم جگر پر مرہم کا کام دیا تھا۔اور موصوف ہی کا اُسوہ باعثِ تسکین ہوا تھا، باربار کی گرفتاری و نظربندی، سامان اور قیمتی ذخیرۂ کتب کی بربادی۔زوالِ صحت و تندرستی اور بزمانۂ اسارت شریکِ حیات کی دائمی جدائی، جب یہ نقشہ سامنے آگیا تو اپنا اچانک حادثہ جو اگرچہ سنگ آمد و سخت آمد کا مصداق تھا۔بھلا دینا پڑا۔مصائب و تکالیف کی طاقت برداشت بھی اپنے اندر عجب کرشمہ رکھتی ہے۔انسان کی ساری ترقیوں کا دار و مدار اسی پر ہے۔حدیث میں آتا ہے: "اشد الناس بلاء الانبیاء" اپنے مرتبہ کے لحاظ سے ہر نبی کو اس سے دوچار ہونا پڑا ہے۔حدیث میں یہ بھی آتا ہے: "ما اوذی نبی ما اوذیت" میرے برابر کسی دوسرے نبی پر مصائب کے پہاڑ نہیں توڑے گئے۔تیرہ سالہ مکی زندگی میں روحانی و جسمانی کونسی اذیت تھی جو مخالفین کے ہاتھوں نہ پہونچی۔

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

گھر سے باہر نکلنا دشوار تھا :-

جنوں میں عشق کے نکلے جو گھر سے
ادھر سے ہم چلے پتھر اودھر سے

یہ مرتبۂ ابتلاء و امتحان خوش نصیبوں ہی کو میسر آتا ہے :-

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدّعی کے واسطے دار و رسن کہاں

حدیث میں یہ بھی آتا ہے کہ "بہادری کسی پر حملہ آور ہو جانے میں نہیں ہے بلکہ غصّہ کے ضبط کرنے اور اذیت برداشت کرنے میں ہے" مولانا آزاد نے بھی سب کچھ برداشت کیا، اسوۂ حسنہ کی وہ کونسی پیروی ہے جو تھوڑی بہت نہ کی، گالیاں کھائیں، پتھر کھائے، اپنوں کے طعنے، غیروں کے جبر کے سہے، قید و نظر بندی کی زندگی گذاری سامان و املاک کی تباہی دیکھی اور اس سب کے باوجود "اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون" کی دعاء خیر کے سوا حرف شکایت زبان پر نہ لائے۔ ایک لفظ بھی اپنی مدافعت و صفائی میں نہ کہا۔

کہنے والے کو ہمیشہ فراخ حوصلگی سے معاف کیا۔ سدا کوہِ وفا اور پیکر استقامت بنے رہے۔ ملک الشعراء ابوطالب کلیم ہمدانی نے شاید مولانا ہی کے لئے کہا تھا:۔

دشنامِ خلق را نہ دہم جز دعا جواب
ابرم کہ تلخ گیرم و شیریں عوض دہم

حضرت لقمان کی اپنے بیٹے کو نصیحت قرآن نے ان الفاظ میں نقل کی ہے:۔

"یا بُنَیَّ اقم الصلوٰۃ وأمُر بالمعروف وانہ عن المنکر واصبر علیٰ ما اصابك ان ذالك من عزم الامور"

اے بیٹے! اس سرچشمۂ خیر نماز کی پابندی رکھنا۔ بھلائیوں کا حکم اور برائیوں سے منع کرتے رہنا۔ اس فرض کی انجام دہی میں غفلت نہ برتنا۔ اس سلسلے میں تمہیں جو مصیبتیں پہونچیں۔ انھیں برداشت کرنا۔ یہ باتیں بڑی ہی اہمیت رکھتی ہیں۔

مولانا ہر ایسے موقع پر صبر واستقامت سے یہ شعر پڑھتے نظر آئے:۔

عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد
من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را

تاریخ بتاتی ہے کہ ایسے ما فوق الفطرت انسان روز پیدا نہیں ہوتے۔ صدیوں میں کسی ملک کی خوش نصیبی میں اضافہ کیا کرتے ہیں۔

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

بخت و اتفاق کے سلسلے میں بات کہاں سے کہاں جا پہنچی اسی اتفاق کے تحت دو ایک واقعے جو دلچسپی سے خالی نہ ہونگے اور سنتے چلئے۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ بیت المقدس پر خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میمنت مہد سے اسلامی جھنڈا لہرا رہا تھا۔ ۱۰۹۹ء میں عیسائیوں نے اس پر تسلط قایم کر لیا۔ گوڈفرے اور ٹنکرو اس میں فاتحانہ انداز سے داخل ہوئے سلطان صلاح الدین ایوبی نے ۱۱۸۷ء میں تقریبًا ۹۰ برس کے

بعد پھر علَم اسلامی لہرا دیا۔ ہندوستان پر بھی اسی عیسائی قوم نے مکمل طور پر ۱۸۵۷ء میں قبضہ کیا۔ یہاں بھی فلسطین کی طرح صدیوں سے مسلمان ہی حکمراں تھے۔ آیندہ سال ۴۷ء میں ۹۰ برس ہوجائیں گے۔ آثار بتا رہے ہیں کہ بیت المقدس کی طرح یہ بدقسمت ملک بھی غیروں کی غلامی سے اسی میعاد کے اندر نجات پا جائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ اسی اتفاق کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ جس دن سلطان نے فلسطین فتح کیا ہے ۲۷ر رجب ۵۸۳ھ تاریخ تھی۔ سلطان نے نماز شکر اسی مسجد اقصیٰ میں ادا کی جس میں ۶۰۰ سال قبل شبِ معراج میں اسی تاریخ میں سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے امامت انبیاء کرام فرمائی تھی۔ کیا اس طرح سلطان نے "الصلوٰۃ معراج المومنین" کا رتبۂ بلند حاصل نہ کرلیا؟

اسی قسم کا اتفاق ۱۵ ر جون ۴۵ء کی تاریخ کو بھی سمجھئے میری تباہی، مولانا کی رہائی، اور پھر دوسرے سال اسی تاریخ میں یکجائی و بزم آرائی،

فکر کی رسائی بھی کیا چیز ہے، کبھی کبھی آسمان سے تارے بھی توڑ لاتی ہے۔ اتفاق ہے اور کیسا پُر لطف اتفاق مولانا کی عمر قمری حساب سے پورے ۶۰ سال کی ہے ۱۳۰۵ھ میں مکّہ معظمہ میں ولادت باسعادت ہوئی ہے "غبار خاطر" اور "کاروانِ خیال" ۶۵ھ میں شائع ہوئیں۔ آخر الذکر میں ۶۵ھ کا مکتوب بھی شامل ہے۔ پورے ۳۰ سال قبل جبکہ آفتاب عمر نصف النہار پر پہونچا ہوا تھا مولانا کی خود نوشت سوانحعمری ۱۳۳۵ھ میں تذکرہ کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ مرزا فضل الدین احمد کے اصرار سے مولانا نے اپنے بزرگوں کے حالات لکھے تھے۔ اصرار شدید پر کچھ اپنا حال بھی لکھنا پڑا۔ اب تذکرہ ناپید ہوگیا ہے جن حضرات کے پاس ہے وہ حرزِ جان بنائے ہوئے ہیں اور کسی قیمت پر علیحدہ کرنے کو تیار نہیں۔ میں اپنے دعوے کی دلیل کے طور پر تھوڑا سا اقتباس پیش کروں گا۔ میں نے دعویٰ کیا تھا کہ مولانا کے مضامین و خطوط میں یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ ایک سے دوسری عبارت

کا درجہ بڑھا ہوا ہے بھی یا نہیں۔ اور اگر ہے تو کس کو کس پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ یہ دونوں مجموعۂ خطوط آپ کے سامنے ہیں اب پورے تیس سال قبل کی عبارت ملاحظہ ہو۔

"درمجلسِ وصالش خُمہا کشیدہ مرداں
چوں دورِ خسرو آمد مے در سبو نماندہ

یہ غریب الدیارِ عہد، و نا آشنائے عصر، بیگانۂ خویش، و نمک پروردۂ ریش، معمورۂ تمنا و خرابۂ حسرت کہ موسوم بہ احمد و مدعو بابی الکلام ہے ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ میں ہستی عدم سے عدمِ ہستی نما میں وارد ہوا اور تہمت حیات سے متہم۔ الناس نیام اذا ماتوا فانتبھوا۔

شورے شد و از خوابِ عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقیست شبِ فتنہ غنودیم

والد مرحوم نے "فیروز بخت" ۱۳۰۵ھ تاریخی نام رکھا تھا اور مصرع ذیل سے ہجری سال کا استخراج کیا تھا۔ ع "جواں بخت و جواں طالع جواں باد"
سبحان اللہ بخت کی فیروزی اور طالع کی ارجمندی!

نیمۂ عمر لغزشوں اور ٹھوکروں کی پامالی و درماندگی میں بسر ہو چکی نیمۂ عمر جو شاید باقی ہے دم لینے اور سستانے میں ختم ہو رہی ہے۔ نہ منزلِ مقصود کا پتہ ہے نہ شاہراہ منزل پر قدم۔ جب پاؤں میں تیزی اور ہمت میں جوانی تھی تو رہ نوردی و منزل طلبی کا دروازہ نہ کھلا۔ اب پامالیوں اور افتادگیوں سے نہ قدم میں پامردی رہی نہ ہمت میں کارفرمائی تو طلب نے آنکھیں کھولیں اور غفلت نے کروٹ لی۔ راہ دور، اور نشانِ منزل گم، کیسۂ زاد خالی اور سر و سامانِ کار ناپید، وقت جا چکا اور ہر آن و ہر لمحہ کاروانِ مقصود سے دوری اور منزلِ مراد سے مہجوری بڑھتی گئی۔ اب قدم کی تیزی اور ہمت کی چستی واپس مل جائے پھر بھی وہ دولتِ وقت کب واپس مل سکتی ہے۔ جو لٹ چکی؟ اور وہ قافلۂ امید کب پس ماندگانِ غفلت کی خاطر لوٹ سکتا ہے جو جا چکا؟

رفتم کہ خار از پا کشم، محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

ساری فیروز بختی اور جواں طالعی کا معاملہ آج نہیں کل فیصل ہونے والا ہے۔ "یوم تبیضّ وجوہ وتسودّ وجوہ" اصل فیروزمندی وہاں کی فیروزمندی ہے اور جواں بخت وہی ہے جو اس آنے والے دن کی آزمائش میں پورا اُترے ....

آبائی وطن دہلی مرحوم ہے۔ سلام علیٰ نجد ومن حل بالنجد۔ (نجد اور نجد کے نازلین پر سلام ورحمت نازل ہو) مگر وطن مادری سرزمین مطہر طیبہ ودارالہجرۃ سیّدالکونین وشہرستان نبوت ووحی ہے۔ قبلۂ عبادت گذارانِ عشق وکعبۂ نیازمندان شوق، علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والتحیۃ

دارم دلِ گرداں کہ من قبلہ نامی خوانمش
روسوئے ابر دیش کند ہر چند می گردانمش

اور وطنِ حقیقی کی نسبت کیا کہئے کہ بحکم کن فی الدنیا کانک غریب ہم سب غربت سرائے ارضی کے آوارہ ومسافر، تمام مسافرانِ ہستی ایک ہی قافلۂ غربت کے رہ سپار، سب کو ایک ہی مستقر وموطن درپیش، البتہ کسی کے لئے ساعت مستقرًا ومقامًا

میں داخل۔ اورکسی خوش نصیب کے لئے حسنت مستقرا و مقاما

وابرح ما یکون الشوق یوما
اذا دنت الخیام من الخیام

مولد و منشا طفولیت "وادیٔ غیر ذی زرع" عند بیت اللہ المحرم ہے، یعنی مکہ معظمہ زاد اللہ شرفاً وکرامۃً، محلہ قدوہ متصل باب السّلام،

بلادٌ بہا تمت علی تمائمی
واول ارض مسّ جلدی ترابہا[۱]

اس وقت کہ ۱۳۳۵ھ قریب الاختتام ہے۔ قافلۂ برق رفتار عمر منزل ثلاثین تک پہونچ چکا۔

یقولون ھل بعد الثلاثین ملعبا؟
فقلت، وھل قبل الثلاثین ملعبا؟

(لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا تیس سال کے بعد بھی کھیل کود کا

---

[۱] یہ وہ دیار ہے جہاں میری گردن میں تعویذ ڈالے گئے یعنی جہاں بچپن کا زمانہ گذرا ہے۔ اور یہی وہ زمین ہے جس کی خاک نے سب سے پہلے میرا بدن مس کیا ہے۔

موقع ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کیا تیس سال سے پہلے بھی کوئی کھیل کھیلا جا سکتا ہے) قریب ہے کہ چشم زدن میں یہ منزل بھی پیچھے رہ جائے اور آگے کا حال کچھ معلوم نہیں۔

کس نمی گوید م از منزل آخر خبرے
صد بیاباں بگذشت و دگرے درپیش است

آپ نے اتفاق ملاحظہ کیا ۱۳۰۵ھ کی پیدائش، ۱۳۳۵ھ میں اشاعت تذکرہ اور ۱۳۶۵ھ میں اشاعت مجموعہ مکاتیب "غبار خاطر اور کاروان خیال" لگے ہاتھوں یہ اتفاق بھی ملاحظہ کرتے چلئے پہلا خط ۴ ستمبر ۱۹۴۰ء کو لکھا گیا تھا اور آخری خط ۴ ستمبر ۱۹۴۵ء کو۔ اس مجموعہ کا آخری خط ۱۱ مئی کی رسید وصول مکتوب کو چھوڑ کر ۴ ستمبر ۱۹۴۵ء ہی کا ہے۔ اتفاقات کو کہاں تک لکھا جائے۔ یہ تو صرف چند وہ اتفاقات تھے جو اس مجموعہ اور اس کے متعلقین سے وابستہ ہیں۔ چونکہ فلسطین و ہندستان کی صورت حالات یکساں تھی اور جدوجہد آزادی ہند کے تقریباً نصف صدی سے مولانا رکن رکین تھے اس لئے اس کا بھی ذکر آگیا۔

بڑے لوگوں میں ایسے خوش نصیب کم ہوتے ہیں جنکی سوانحمریاں ان کی زندگی میں مرتب ہوجائیں۔ اس معاملہ میں مولانا خوش نصیب ہیں۔ انگریزی اور اردو میں مختلف لکھنے والوں نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق حالات مرتب کئے ہیں، ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۹۱۹ء میں تذکرہ شائع ہوا تھا۔ دو سوانح عمریاں صدارت انڈین نیشنل کانگریس بہ اجلاس رام گڈھ ۱۹۳۹ء میں لکھی گئیں۔ مسٹر مہا دیو ڈیسائی نے کافی صفحات کی کتاب حالات میں لکھ ڈالی جو یورپ میں بھی کافی مقبول ہوئی۔ ابھی حال میں کئی سو صفحے کی سوانح حیات مسٹر راجپوت ایم۔ اے کی لکھی ہوئی۔ انگریزی میں سامنے آئی۔ مولانا پر بے شمار مقالہ نگاروں میں چوٹی کے رہنما اور صف اوّل کے مشاہیر اہل قلم، علامہ سید سلیمان ندوی، خواجہ حسن نظامی۔ مسٹر آصف علی۔ چراغ حسن حسرت۔ یوسف مہر علی۔ مولانا ضیاء الحسن علوی ندوی۔ نصر اللہ خاں عزیز۔ مسٹر مہا دیو ڈیسائی۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور مسٹر جان گنتھر کے نام بھی نظر آتے ہیں۔ عبداللہ بٹ نے مقالوں کا

یہ مجموعہ بھی شائع کیا ہے اور مختصر حالات علیٰحدہ بھی لکھے ہیں۔ ایسا بھی کم ہوتا ہے کہ بڑا آدمی خاندان وحسب ونسب کے اعتبار سے بھی بڑا ہو۔ ہمارے یہ دونوں بزرگ اس سعادت سے بھی بہرہ اندوز ہیں۔

خاندانی عزت ووجاہت، نسبی نجابت وشرافت اور حسبی علو ورفعت سے بھی مالامال ہیں۔ ایک اگر نامور شروانی قوم کا فخر خاندان فرد ہے تو دوسرا صدیقی نسل کا چمکتا ہوا چراغ اور خاندانِ علماء وصلحاء کا بدرِ مُنیر، ایک کے اجداد کرام نسلاً بعد نسلٍ امارت وریاست سے بہرہ ور رہے ہیں تو دوسرے کے آباء عظام مسند آراء علم ومعرفت، ایک کے مورث اعلیٰ عمر خاں شروانی وغیرہ وزراء وامراء سلطنت ہند ہوئے ہیں تو دوسرے کے اسلاف قاضی القضاۃ، مفتی اعظم اور رکن لمدر انتین کے عہدۂ جلیلہ پر سرفراز

یہ شرف وعزت اضافی ہے اس پر فخر وغرور عالی ظرفوں کا کام نہیں یہ اختیاری کب ہے اور غیر اختیاری پر فخر وغرور

کیسا۔ عرفیؔ نے کیا خوب کہا ہے :۔

اما نبود وصف اضافی ہنر ذات
ایں فتوئ ہمت بود ارباب ہمم را
ایں برق نجابت کہ جہد از گہرِ من
برح است ولے گوہر ذاتِ ابُ عم را
وصفِ گل وریحاں بہوا باز نہ گردد
ہر چند ہوا عطر دہد قوتِ شم را
المنۃ لِلّٰہ کہ بنازم بہ نسب نیست
اینک بہ شہادت طلبم لوح و قلم را

یہ وہی عرفی شیرازی ہیں جن کی عمر بھر کی کمائی یعنی مکمّل و مرتّب دیوان ہاتھ سے چھوٹ کر دریا میں گر گیا، کشتی میں بیٹھے کہیں جا رہے تھے صدمہ ہوا اور ہونا ہی چاہئے تھا تھوڑی دیر کے بعد سر اُٹھایا اور برجستہ یہ شعر کہا :۔

گفتہ گر شد ز کفم شکر کہ ناگفتہ بجاست
از دو صد گنج یکے مشتِ گہر باختہ ام

یہ ہے اصل نجابت و شرافت۔ اب جو کچھ کلام ہے یہ اس کے بعد کا کہا ہوا ہے۔ اسی لئے نادر شاہ نے استفسارِ نسب نامہ کے موقع پر اپنے آپ کو شمشیر ابن شمشیر ابن شمشیر کہا تھا خود مولانا نے تذکرہ کے ابتدائی اوراق میں اس پر کافی لکھا ہے۔ اسلافِ کرام کے حالاتِ فضل و کمال لکھنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں :۔

"انسان کے لئے معیار شرف جوہر ذاتی اور خود حاصل کردہ علم و عمل ہے۔ نہ کہ اسلاف کی روایاتِ پارینہ اور نسب فروشی کا غرور باطل، ہم کو ایسا ہونا چاہیئے کہ ہماری نسبت سے ہمارے خاندان کو لوگ پہچانیں۔ نہ یہ کہ اپنی عزت کے لئے خاندان کے شرف رفتہ کے محتاج ہوں۔ ارباب ہمت نے ہمیشہ اپنی راہ خود نکالی ہے اور اپنی عظمت و رفعت کی تعمیر صرف اسی سامان سے کی ہے جو خود اُن کا بنایا ہوا تھا۔ نپولین کا ایک قول مجھے نہیں بھولتا۔ فتح پروشیا کے بعد جب فریڈرک اعظم کی قبر پر

گیا تو دیکھا کہ فریڈرک کی تلوار قبر پر لٹک رہی ہے نپولین نے تلوار اُتار کر ایک ساتھی کے حوالہ کی اور کہا کہ پیرس کے عجائب خانہ کی نذر کر دوں گا۔ یہ سُن کر جنرل نے کہا "اگر مجکو ایسی باعظمت اور تاریخی تلوار ملتی تو کبھی کسی دوسرے کو نہ دیتا" نپولین نے کہا "کیا میرے پاس میری تلوار نہیں ہے"۔ خاندان کے فخر کا بت بھی دنیا کے عہد جاہلیت کی ایک یادگار منشوم ہے اور اسلام نے انسان کے بہت سے بنائے ہوئے بتوں کے ساتھ اس کو بھی توڑ دیا تھا بہت ممکن ہے کہ کل کو ایک نومسلم چمار اپنے حُسن عمل سے وہ مرتبہ پائے جو شیخ الاسلاموں کی اولاد کو نصیب نہ ہو۔ یہ کل کو ہونے والی بات ہے اور آج بھی دنیا میں دیکھ رہے ہیں کہ "عمل" کا فرشتہ کتنے ہی بڑوں کو چھوٹا کرتا ہے اور کتنے ہی چھوٹوں کو بڑا بناتا ہے۔

"کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست"

مولانا کے متعلق اس سے زیادہ کیا لکھوں کہ:

گوہرے کز دو کون بیرون است
مے تواں یافت در خزانۂ ما

نواب صاحب کے متعلق مجلہ مصنف علیگڈھ جنوری ۱۹۴۶ء میں لکھ ہی چکا ہوں :-

بہت لگتا ہے جی صحبت میں اُن کی
وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہیں

جا کر ملئے جی خوش ہو جائے، بزرگوں کی حکایتیں، اسلاف کی داستانیں، صحابۂ کرام کے حالات، اسوۂ حسنہ کی تعلیمات، لسان الغیب حافظ کے دیوان کے اشعار یہی مجلس کی گفتگو ہیں اور یہی محفل کی باتیں۔ متعنا اللہ بطول بقائہٖ۔

شروانی خاندان میں نواب صاحب سے بڑھ چڑھ کر بعض صاحب ثروت وریاست بزرگ گذرے ہیں علم و عمل کے لحاظ سے بھی بعض ملک میں کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں، مصنف و مؤلف بھی ہوئے ہیں۔ لیکن یہ علم و عمل اور فضل وکمال، کسی دوسرے کو حاصل نہ تھا۔ بلا خوف

لو مثہ لائم کہا جا سکتا ہے کہ پوری نسل میں ایسی جامع صفات
ہستی آج تک نہیں گذری، یہی وجہ تھی کہ سرکار نظام کی نظر
توجہ اپنے اُستاد نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خاں
کی وفات کے بعد ان پر پڑی اور ۱۳۳۶ھ میں صدارت امارت
شرعیہ کے عہدہ پر سرفراز فرمایا۔ صدر الصدور کے لقب سے
ملقب ہوئے۔ ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹۲۲ء میں "نواب صدر یار جنگ
بہادر" کا خطاب ملا۔ ۱۳ سال تک یہ خدمتِ دینی انجام دی کر
پیرانہ سالی کی بنا پر مارچ ۱۹۳۰ء میں سبکدوشی حاصل کر لی۔
ہندوستان کے تمام مشہور اداروں کے رُکن و عہدہ دار ہیں
اب اپنے کتاب خانہ حبیب گنج ضلع علی گڈھ کی نادر الوجود
کتابوں کے مطالعہ میں وقت صرف فرماتے ہیں۔ مولانا آزاد
کا تدبر و تفکر، علم و ادب، تقریر و تحریر اور فضل و کمال، بدوِ شعور
ہی سے وجہِ کشش رہا۔ علمی تبحر کے ساتھ سیاسی
جدّ و جہد اور ایثار و قربانی نے اعتقاد کا درجہ
عطا کر دیا۔

دین و دل ربود از من جنبشِ دو ابرویش
دور چشمِ مست او برد ہوشیاری ہا

اپنی نااہلی کا پورا اعتراف ہے۔ دونوں باکمال بزرگوں کی فرطِ عقیدت نے یہ سطریں قلم سے نکلوا دی ہیں اور میں فخر کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ "کاروانِ خیال" کے دیباچہ لکھنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔

گرچہ از نیکاں نیم خود را بہ نیکاں بستہ ام
در ریاضِ آفرینش رشتۂ گلدستہ ام

مکاتیب کے متعلق میں نے کچھ نہ لکھنے کے برابر لکھا ہے۔

"مشک آن است کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید"

ناظرین کی رائے پر چھوڑ دیا ہے۔ البتہ مولانا کے خطوط میں لکھے ہوئے عربی اشعار کا بالترتیب ترجمہ و مطلب اور ضروری معلومات کا آخر میں درج کرنا ناگزیر ہے تاکہ عربی سے ناواقف حضرات بھی اس سے فائدہ اٹھا لیں۔

۱۔ کأنْ لّمْ یکن بین الحجون الی الصفا ۲ انیس ولم یسمر بمکۃ سامرٌ!

گویا حجون سے لے کر صفا تک نہ تو کوئی انیس و ہمدم رہا اور نہ مکّہ ہی میں کوئی رات کا جلیس و ہم صحبت قصّہ گو باقی رہا۔

یہ عمرو الخزاعی کا شعر ہے۔ قریش سے پہلے قبیلہ خزاعہ ہی سکّانِ حرم اور خدّامِ کعبہ تھے۔ شاعر نے فراقِ مکّہ اور خزاعہ کی جدائی خانہ کعبہ پر تاسف کا اظہار کرتے ہوئے اشعار کہے ہیں ان ہی میں سے ایک شعر یہ بھی ہے :۔

۲۔ وحدثتنی یا سعد عنہا فزدتنی جنوناً فزدنی من حدیثک یا سعد!

اے سعد! تو نے محبوبہ کا ذکر چھیڑ کر میرے جنون میں اضافہ کر دیا۔ مہربانی کر کے اپنی گفتگو دراز کر تا کہ میرا جنون بھی بڑھتا چلا جائے)

۳۔ عیون المھی بین الرصافۃ والجسر ۳ جلبن الھوی من حیث ادری ولا ادری

رصافہ اور جسر کے درمیان رہنے والی جنگلی گایوں کی نشیلی آنکھوں نے محبت کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔ علی بن الجھم کے مطلع کا ایک مصرع درج کتنیب کیا گیا ہے۔

---

۱ حجون پہاڑ ہے اسفل مکّہ میں۔ ۲ کوہ صفا مشہور و معروف ہے۔
۳ جسر پل کو کہتے ہیں۔ بغداد کا پل مراد ہے۔

۴۔ اقول لصاحبی والعیس تھوی — بنا بین المنیفۃ فالضمار

تمتع من شمیم عرار نجد — فما بعد العشیۃ من عرار

شہور ینقضین وما شعرنا — بانصاف لھن ولا سرار

فاما لیلھن فخیر لیل — واطیب ما یکون من النہار

میں نے اپنے ساتھی سے کہا جب کہ اونٹ چشمۂ بنو تمیم۔ منیفہ اور ضمار رگاؤں) کے درمیان ہمیں لئے ہوئے تیزی سے چل رہے تھے۔

نرگسِ نجد کی خوشبو سے فائدہ اٹھالے آج کی شب کے بعد پھر اس کا میسر آنا مشکل ہے۔ یہ عیش و طرب اور خوش وقتی کے ایسے مبارک مہینے ہیں کہ گذرے چلے جا رہے ہیں اور ہمیں ان کے نصف اور خاتمہ کا پتہ بھی نہیں چلتا یعنی عیش کے دن چونکہ جلدی گذرتے ہیں اور انسان عیش و آرام و غفلت میں سرشار رہتا ہے اس لئے اسے وقت کے گذرنے کا علم بھی نہیں ہوتا۔ لہذا ہمیں بھی اوقات کا پتہ نہ چل سکا۔

ان مہینوں کی راتیں بہترین راتیں ہیں اور دن بھی بڑے خوشگوار ہیں اطیب کی جگہ اقصر کا لفظ نظر پڑا۔ "واقصر ما یکون من النہار"۔ یعنی ان مہینوں کے دن کس قدر چھوٹے ہیں۔ راحت کے دن چھوٹے اور کم

معلوم ہی ہوتے ہیں مصیبت کی گھڑیاں ہی کاٹے نہیں کٹا کرتیں مولانا نے اوّل و آخر کے چار اشعار نقل کئے ہیں۔ دو شعر درمیان میں رہ گئے ہیں۔ وہ بھی سُن لیجئے۔ حماسہ وغیرہ میں شاعر کا نام ہی نہیں دیا گیا۔

صاحب معاہد التنصیص شرح شواہد التلخیص نے ان اشعار کو الصمۃ القشیری کی طرف منسوب کیا ہے اور قیل کہہ کر جعدہ بن معاویہ کا ضعیف قول بھی نقل کر دیا ہے۔ درمیانی اشعار یہ ہیں :۔

الا یا حبذا نفحات نجد | وریّا روضۃ بعد القطار
واھلك اذ یحل الحی نجدا | وانت علی زمانك غیر زار

نجد کی خوشبوئیں اور اس کے باغیچوں کی بارش کے بعد تر و تازگی کیسی دلفریب و خوش گوار ہے۔

نجد کے رہنے والے محبّت کئے جانے کے قابل ہیں۔ یہاں آنے کے بعد انسان اپنے زمانہ کا شاکی نہیں ہوتا یعنی دنیا و ما فیہا سے بے خبر ہو کر مسرت و شادمانی کی زندگی گذارتا ہے۔

۵۔ قلبی یحدثنی بانك متلفی | روحی فداك عرفت ام لم تعرف

میرا دل مجھے بتا رہا ہے کہ تو مجھے ہلاک کرنے والا ہے۔ میری جان تجھ پر فدا ہو خواہ تجھے اس کا علم ہو یا نہ ہو۔

شرف الدین ابو حفص عمر ابن الفارض المتوفی ۶۳۲ھ کے اشعار کے قصیدہ کا یہ مطلع ہے۔ ساتویں صدی ہجری میں بڑے ۵۱
پایہ کے بزرگ و ادیب گذرے ہیں۔ کلام کا اکثر حصّہ معرفت میں ڈوبا ہوا ہے۔ نظر غور سے دیکھا جائے تو یہ مطلع اور سارا قصیدہ بھی معرفت ہیں ہے۔ دوسرا شعر ہے:

لم اقضِ حق ھواکِ ان کنت الذی ‏ لم اقضِ فیہ اسیً ومثلی من یفی

تیری محبت کا حق نہ ادا کر سکوں گا اگر تیرے غم میں جان نہ دے سکا اور میرا جیسا باوفا عاشق وفاء عہد ہی کرے گا۔

یہ بزرگ سلطان محمد کے زمانہ میں گذرے ہیں۔ سلطان کو علم ادب اور شعرا و ادبا سے بڑی دلچسپی تھی۔ ایک مجلس میں سلطان نے کہا کہ سب سے دشوار قافیہ کے اشعار پڑھے جائیں۔ بحث کے بعد مشکل ترین قافیہ یائے ساکن کا مانا گیا۔ شعراءِ دربار نے اشعار سنانا شروع کیے۔ آٹھ۔ دس شعر سے زیادہ کوئی نہ سنا سکا

آخر میں سلطان نے پورے پچاس اشعار کا اس قافیہ میں قصیدہ سنایا۔ قاضی شرف الدین نے آخر میں عرض کیا کہ میں ڈیڑھ سو اشعار کا ایک ہی قصیدہ سناتا ہوں اور یہ کہہ کر

سائق الاظعان یطوی البید طے

منعما عرّج علیٰ کثبان طے

پورا قصیدہ سُنا دیا۔ سلطان نے اظہار حیرت کرتے ہوئے کہا میرے کتاب خانہ میں شعرا رجاہلیت و اسلام کے دواوین بھرے پڑے ہیں۔ پوری تلاش کے بعد میں پچاس اشعار سے زیادہ پر واقفیت حاصل نہ کر سکا۔ یہ قصیدہ تم نے کہاں سے حاصل کیا۔ اور اس کا کہنے والا کون باکمال و قابل قدر شخص ہے۔ قاضی صاحب نے علامہ ابن الفارض کا نام و مقام بتایا۔ سلطان مشتاقِ ملاقات ہو کر قاہرہ پہونچا۔ قاضی صاحب کو ایک ہزار دینار نذر کے لئے دے کر کہا کہ ہماری طرف سے پیش کر کے کہنا کہ۔

"تمھارے سعادت مند ولد محمد نے سلام عرض کیا ہے اور تمنائے ملاقات ظاہر کی ہے"

قاضی صاحب نے عذر پیش کیا کہ نہ تو ابن الفارض اس نذر کو قبول کریں گے اور نہ اس پیغام رسانی کے بعد مجھے حاضر دربار ہونے دیں گے۔ سلطان کے اصرار پر مجبوراً جانا پڑا۔ جب حرفِ مطلب ادا کیا گیا تو ایک سال کے لئے اپنے یہاں آنے کی بندش کرتے ہوئے مجلس سے اٹھا دیا۔ سلطان نے حسرت سے کہا کہ میرے زمانہ میں ایسی ہستی موجود ہو اور میں زیارت سے محروم رہوں۔ ایک روز اچانک اپنے چند مصاحبین کو لے کر پہونچ ہی تو گئے۔ علامہ کو پتہ چلا تو دوسرے دروازے سے نکل کر اسکندریہ چلے گئے اور زمانۂ دراز تک وہیں رہے۔ دیکھا آپ نے اہلِ سطوت وثروت کی مردم شناسی و قدر دانی، اور صلحا و علماء اور اہلِ کمال کا استغناء و روگردانی!

۶۔ وابرح ما یکون الشوق یوماً اذا دنت الخیام من الخیام

جس دن محبوب کے خیموں سے حبیب کے خیمے قریب ہوں گے اس روز شوق کا کیا عالم ہوگا۔

فارسی شاعر نے بھی اس مضمون کو خوب ادا کیا ہے:-

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک
آتشِ شوق تیز تر گردد

تزئین الاسواق میں ابرح کے بجائے اعظم کا لفظ ہے۔ معنیٰ میں کوئی خاص فرق پیدا نہیں ہوتا۔

۷۔ ولیس للہ بمستنکر اِن یجمع العالم فی واحد

اللہ کی قدرت سے یہ کچھ بعید نہیں کہ سارے عالم کو ایک ذات میں جمع کردے، یعنی ایک شخص کو بہت سے کمالات عطا فرمادے۔

یہ شعر ابو نواس المتوفی ۱۹۹ھ کے اُن چھ اشعار میں سے ایک ہے جو خلیفۂ ہارون رشید کو فضل بن ربیع کی تعریف میں لکھ کر پیش کئے گئے تھے۔ اس سے اوپر کے دو شعر یہ ہیں :۔

انت علی مابك من قدرة خلست مثل الفضل بالواجد

اوحده اللہ فما مثله لطالب ذاك ولا ناشد

خلیفہ کو مخاطب کرکے شاعر کہتا ہے کہ اپنی تمام دولت وثروت، قدرت وسطوت کے باوجود فضل بن ربیع جیسا دوسرا کامل نہیں پاسکتا۔ اللہ نے اُسے یگانہ ویکتا بنایا ہے۔ طلب وتلاش کے باوجود اس جیسا دوسرا نہیں مل سکتا۔

پہلے شعر کا پہلا مصرع یوں بھی بعض مقامات پر دیکھا:
"ولیس علی اللہ بمستنکر"

اسی شعر کے ہم معنیٰ ابن قلاقس نے بھی شعر کہا ہے:

وقد جمع اللہ فیک الانام ولیس علیہ بمستنکر

اللہ نے تیری ذات میں سب خلق جمع کر دی ہے، اور یہ سب کچھ اس پر دشوار نہیں۔

۸۔ ومن بعد ھذا ما یدق بیانہ وما کتمہ احظی لدیہ واجمل

اس تمام روداد غم کے بعد ایک بات ایسی بھی ہے جس کا بیان حد درجہ دشوار اور اس کا پردۂ خفا میں رہنا زیادہ پسندیدہ و مستحسن ہے۔

۹۔ قلیل منک یکفینی ولکن قلیلک لا یقال لہ قلیل

تیری جانب سے تھوڑی بات بھی میرے لئے بہت کافی ہے۔ کیونکہ تیرے تھوڑے کو تھوڑا کہا ہی نہیں جا سکتا۔

ایک دوسرے شاعر نے اسی مضمون کو کس خوبی سے ادا کیا ہے اور حبیب کے لفظ نے اس موقع کے مناسب کتنا لطف پیدا کر دیا ہے:-

لاتحقرنّ قلیل من احبتہ　　　　انّ القلیل من الحبیب کثیر

اپنے محبوب کی کم توجہی کو کم نہ سمجھ، دوست کا تھوڑا بھی بہت ہوتا ہے

ابن الطثریہ نے کیا خوب کہا ہے :-

الیس قلیلاً نظرۃ ان نظرتہا　　　　الیکِ وکلا لیس منکِ قلیل

میرا تیری طرف ایک نظر دیکھ لینا کوئی حیثیت نہیں رکھتا لیکن تیری ایک نظر اے محبوبہ! کم نہیں کہی جا سکتی۔

ابو معاذ نے بخیل کی تعریف میں یہی مضمون ادا کیا ہے:

فاذا اَقلّ لی البخیل عذرتہٗ　　　　انَّ القلیل من البخیل کثیر

بخیل کا تھوڑا دینا ملامت کا مستحق نہیں۔ اسے معذور سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ بخیل کا تھوڑا بھی بہت کا حکم رکھتا ہے۔

اسحٰق بن ابراہیم الموصلی کہتا ہے:

ان ماقلّ منک یکثرُ عندی　　　　وکثیرٌ ممّن تحبّ القلیل

اے محبوبہ! تیری تھوڑی سی نگہ التفات میرے نزدیک خزانۂ بے کراں کا حکم رکھتی ہے اور تیرے حبیب کا تیری طرف ہر وقت متوجہ رہنا بھی کم ہی سمجھا جائے گا۔ دوسرے مصرع کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جیسے تم محبوب

رکھتے ہو اُس کی تھوڑی توجہ بھی بہت ہوتی ہے۔

۱۰۔ کیف الوصول الیٰ سعاد ودونہا	قلل الجبال وبینہن خیوف

سعاد تک کیسے پہونچا جا سکتا ہے۔ اس کی راہ میں پہاڑوں کی چوٹیاں اور ان کی گھاٹیاں حائل ہیں۔

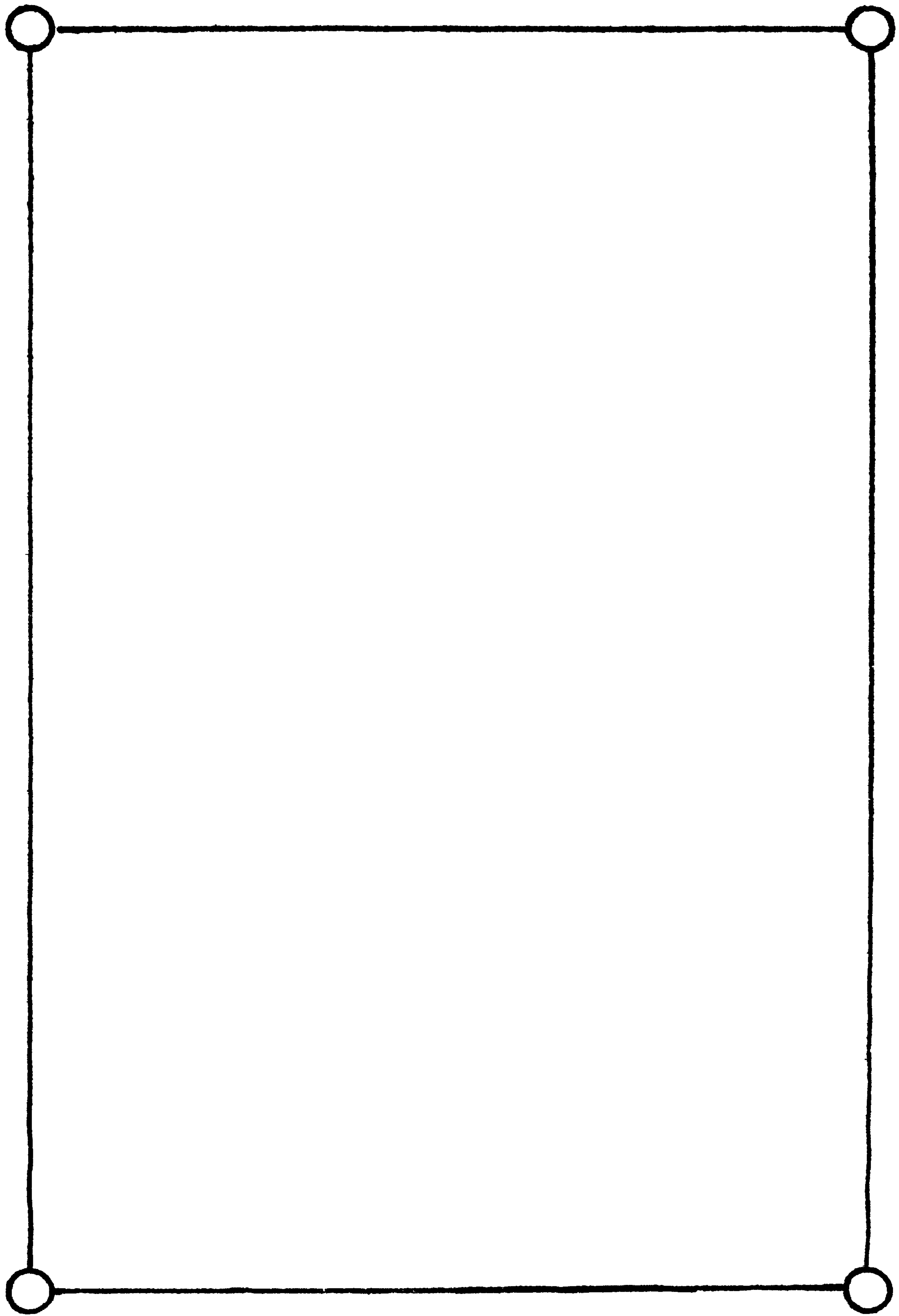
مولانا نے ۲۰ جون ۱۹۴۲ء کے مکتوب سامی میں انندرام مخلص کی کتاب مرأۃ المصطلحات کے متعلق دریافت کیا ہے۔ اس کا جواب شامل مکاتیب نہیں ہے۔ اس کتاب کا کوئی نسخہ نہ کتاب خانۂ حبیب گنج میں ہے نہ لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں۔ لٹن لائبریری میں "حالات عہد محمد شاہ بادشاہ غازی" خود مخلص ہی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے موجود ہیں، آخر میں ناقص ہے۔ ۲۴ ذیقعدہ سنہ ۱۱۶۰ھ کی لکھی ہوئی ہے محمود افغان حارس قندھار و مسلط ایران کے حالات سے ابتدا ہوئی ہے اور بابا درکاہی درویش اودواسے کے احوال پر اختتام، اس کے جلیس و ہم صحبت سراج الدین علی خاں آرزو اور

میر شمس الدین فقیر بھی صاحبِ تصانیف اور فاضلانِ عہد میں سے ہیں۔

سراج الدین علی خاں آرزو کی مصنفات تصحیح غرائب اللغات[۱]، موہبت عظمیٰ[۲] (معانی و بیان) اور عطیہ کبریٰ[۳] (عروض) محررہ ۱۲۱۵ھ و ۱۲۳۵ھ اور میر شمس الدین فقیر کی تصانیف خلاصۃ البدیع[۱] اور تذکرۂ شعراء محررہ ۱۲۶۳ھ بقلم میر نواب موزوں بھی لٹن لائبریری میں محفوظ ہیں۔ مراۃ المصطلحات غالباً طبع نہیں ہوئی ہے۔ اس کا کوئی نسخہ نظر سے نہیں گذرا،

محمد عبدالشاہد خاں شروانی
اورینٹلسٹ لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

بیت المصنّف | کانفرنس کمپاؤنڈ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ
۱۶ ذی قعدہ ۱۳۶۵ھ مطابق ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۶ء



۱۹- اے بالی گنج سرکلر روڈ۔ کلکتہ
۴ ستمبر ۱۹۴۰ء

صدیقی العزیز۔ آج الماریوں میں ایک کتاب ڈھونڈھ رہا تھا، اتفاقاً ایک مجلد پر نظر پڑ گئی، دیکھا تو ارشادالکملا، وغیرہ ندوہ کے بعض رسائل کا مجموعہ تھا اس مجموعہ کو دیکھتے ہی ذہن ندوہ کی صحبتوں کی طرف منتقل ہوا اور پھر اچانک آپ یاد آگئے۔

قاصدے کو کہ فرستم بہ تو پیغامے چند

بے اختیار جی چاہا کہ آپ سے ملاقات ہوتی، افکارِ زمانہ اور کاوشہائے روزگار سے الگ ہو کر دو گھڑی بیٹھتے اور پچھلی صحبتوں کی یاد تازہ کرتے، جام و مینا کا دور نہ سہی چائے کے پیالہ ہائے پے ہم کیا کم ہیں ؎

زخیلِ دردکشاں غیر ما نماند کسے
بیار بادہ کہ ماہم غنیمتیم بسے

مڑکے دیکھتا ہوں تو گذری ہوئی صحبتیں ایک ایک کرکے سامنے آتی ہیں اور کچھ دیر کے لئے ایک بالکل دوسرے ہی عالم میں پہنچا دیتی ہیں۔ آپ سے پہلی ملاقات لکھنؤ میں ہوئی تھی جب الندوہ کی ایڈیٹری کے سلسلہ میں وہاں مقیم تھا۔ ۱۹۰۵ء کی بات ہے۔ پورے پینتیس برس ہوگئے۔ اس وقت یاد آرہا ہے کہ آپ دیوان صائب کا ایک نسخہ عبدالحسین سے لینا چاہتے تھے۔ اس کی حیثیت پر گفتگو ہوئی تھی۔ دہلی کا جلسہ ندوہ آپ کو یاد ہے؟ غالباً ۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۰ء کی بات ہوگی۔ مرحوم مولانا شبلی، آپ اور میں، مولوی عبدالاحد مرحوم کے یہاں ٹھیرے تھے اور شب و روز صحبتیں رہتی تھیں۔ امین آباد لکھنؤ میں مولانا مرحوم کا بالاخانہ اور لیگ کے جلسہ کے موقع پر وہاں قیام، یہ غالباً ۱۹۱۲ء کی بات ہے۔ اٹھائیس برس ہوگئے۔ اس وقت سوچتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کل کی بات ہو۔ لبثنا یوماً او بعض یوم اور لم یلبثوا الا عشیۃ او ضحٰہا کا شاید یہی مطلب ہے ۱۹۱۴ء میں حکیم صاحب مرحوم کے یہاں ٹھیرا تھا۔ آپ بھی

دہلی آئے اور پانی پت کا بہ اتفاق سفر کیا۔ اس سفر کی صحبتوں کی ایک ایک بات اس وقت صفحۂ دماغ پر اُبھر رہی ہے۔ افسوس، جتنے ہم نفس تھے ایک ایک کر کے سب رخصت ہوگئے، وہ صحبتیں خواب و خیال ہوگئیں۔ اب برسوں گذر جاتی ہیں ایک متنفس بھی میسر نہیں آتا جس سے دو گھڑی بیٹھ کر اپنے ذوق و طبیعت کی چار باتیں کر لوں، اب نہ زمانہ ہماری طبیعتوں کا متحمل ہے، نہ ہم زمانے کے سانچوں میں ڈھل سکتے ہیں۔

کأن لم یکن بین الحجون الی الصفا
انیس، ولم یسمر بمکۃ سامر!

اس وقت صبح کے ساڑھے چار بجے ہیں، چائے پی رہا ہوں اور یہ خط لکھ رہا ہوں ؎

گرچہ دوریم بیادِ تو قدح می نوشیم
بُعدِ منزل نہ بود در سفرِ رُوحانی

یہ ساری درازنفسی اس لئے ہے کہ کسی ہم نفس سے باتیں کرنیکو

جی چاہتا تھا، آپ یاد آ گئے، ملاقات میسر نہیں ہے تو دل کی آرزومندیوں کو صفحوں پر بکھیر رہا ہوں ؎

در ہیچ نسخہ معنئ لفظِ اُمید نیست
فرہنگ نامہ ہائے تمنا نوشتہ ایم

اس وقت سوچ رہا تھا آپ سے آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟ غالباً سنہ ۱۹۲۰ء میں حکیم صاحب مرحوم کے یہاں دہلی میں۔ میں نظربندی سے چھوٹا تھا آپ حیدرآباد سے آئے تھے۔ دونوں جہتوں میں بُعد المشرقین تھا مگر طبیعت کی ہم ذوقی ایک صحبت میں جمع کر دیتی تھی ؎

بیا کہ رونق ایں کارخانہ کم نہ شود
ز زہدِ ہمچو توئی یا بہ فسقِ ہمچو منی

معلوم نہیں ملّا صاحب[1] سلمہ اللہ تعالیٰ کا کیا حال ہے؟ اُن کا کونین کو "کونین" بروزن "زوجین" کہنا اس وقت بھی دماغ میں گونج رہا ہے۔ آپ کو موقعہ یاد آیا؟ جلسہ ندوہ کے موقعہ پر

[1] حاجی ملا احمد صاحب خاص قدیم نواب صدر یار جنگ بہادر سفر و حضر کے جلیس ظریف ہیں عمر میں بڑے ہیں ۱۲

جب مولوی عبدالاحد مرحوم کے یہاں ٹھیرے ہوئے تھے اور مجھے بخار آیا تھا۔ میں نے کونین کی مقدار بڑھانی شروع کی اور ملّا صاحب نے اس کے مثالب و قبائح پر مسلسل لکچر دینا شروع کر دیا۔ افسوس اب ان صحبتوں کی صرف یاد باقی رہ گئی ہے۔

اب اذان ہو رہی ہے، خط ختم کرتا ہوں والسّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

ابوالکلام کان اللہ لہٗ

حبیب گنج ضلع علی گڈھ۔

قلم را آں زبان نبود کہ سرّ عشق گوید باز
بروں از حدِّ تقریر ست شرحِ آرزومندی

صدیق حبیب۔ حماک اللہ عن شر النوائب جو محبت نامہ ۴½ بجے صبح کو دوران چارپیں لکھا گیا تھا ۳½ بجے سہ پہر کو عین جلسۂ چارپیں پہنچا۔ ملّا صاحب "ہم پیالہ" تھے۔ ان کے گوشِ شوق میں ایک مہربان کی صدا آرہی تھی۔

چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی
بیاد آر حریفانِ بادہ پیما را

کیا کہوں کس قدر مسرت نامۂ گرامی پڑھ کر ہوئی۔ اسی وقت مکرر پڑھا، اس کے بعد کئی بار پڑھ چکا ہوں۔ ہر بار دماغ دل بوئے محبت سے باغ باغ ہوا ہے۔ خلوص سدا بہار ہے۔ اور اس ہنگامہ ہستی میں یہی ایک نعمت ابدی ہے۔ آپ نے جتنے واقعے یاد کیے ہیں یاد دلائے ہیں سب کی مدت دہائیوں

سے زیادہ ہے مگر خط پڑھنے میں دل ان کی گرمی اس طرح محسوس کرتا تھا گویا اسی صحبت میں ہے۔ بات میں بات دلّی کے جلسۂ ندوہ میں آپ کی تقریر کا عالم یادِ شوق میں تازہ ہے۔ آپ کے کھڑے ہونے کا انداز، تقریر کا جوش، آواز کا لہجہ گویا دیکھ رہا ہوں، سن رہا ہوں، حالانکہ تیس برس گذر گئے۔ سید رشید رضا کی عربی تقریر کا اُردو ترجمہ آپ سنا رہے ہیں، کان سن رہے ہیں۔ اسی مثال سے متاثر ہو کر میں نے اسٹریچی ہال میں (اُن کی) عربی کی اُردو کر دی تھی۔

مولانا شبلی پر خدا کی رحمت۔ اب تک ان کی یاد جان آفریں ہے۔ دارالمصنفین میں تو گویا تجدیدِ بیعت ہو جاتی ہے۔

دماغِ دل دریں جا گاہ گاہے چاق میگردد
خدا آباد تر سازد خراباتِ محبت را

جس زمانے میں آگرہ میں پڑھتا تھا، نصف صدی گذر چکی ہے فیضی کی ایک غزل پڑھی تھی۔ اس کا ایک شعر اب تک وردِ دل ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کتنی بار اور کتنے موقعوں پر

تسلّی بخش ہوا ہے۔

اے ہم نفسانِ صحبتِ ما
رفتید ولے نہ از دلِ ما

مجلسِ احباب دل میں گرم ہے دل میں اس کی گرمی ہے۔

زچشمِ مستِ تو مستم شراب راچہ کنم
زتابِ حسن تو سوزم کباب راچہ کنم

دیکھیے اس ہفتہ میں مولانا کی یاد کس کس طرح تازہ ہوئی۔ آپ کے الطاف نامے سے۔ مولوی سید سلیمان کے خط سے۔ ایک جلد سوانح شبلی کی ختم ہوئی۔ ایک نادر نسخہ رباعیات سحابی نجفی کا ہاتھ آیا۔ مولانا کا نسخہ یاد آیا' ندوہ سے اس کی بابت خط و کتابت کی۔

جواب کے لئے بڑا سا صفحہ انتخاب کیا تھا' سب ختم ہوگیا۔ لکھا کچھ بھی نہیں۔

محبت نامے نے شوقِ ملاقات کی سوزش میں اشتعال پیدا کردیا ہے۔ دل میں بے تابی ہے کہ ملاقات ہو جو صحبتِ

گذشتہ کی گرمی تازہ کرے۔ حیاتِ تازہ بخشے۔ سوال یہ ہے کہ کہاں ہو۔ ملّا صاحب سلامِ شوق پیش کرتے ہیں اور کونین بروزن زوجین کے ذکر میں دوسرا جزو بڑھاتے ہیں کہ دو بجے شب کو دودھ لانے کا حکم ہوا تھا، تعمیل ہوئی تھی والسّلام بالاکرام۔

حبیب الرحمٰن

۱۹ اے بالی گنج۔ کلکتہ

۲۹ ستمبر ۱۹۴۰ء

صدیق مکرم۔ سفر سے واپس ہوا تو ڈاک میں صحیفہ مودت ملا۔ طبیعت تھکی ہوئی اور ہجوم اشغال سے بے کیف تھی لیکن آپ نے پچھلی صحبتوں کی یاد تازہ کر کے ساری تھکن بھلا دی

وحدثتنی یا سعد عنہا فزدتنی

جنونًا فزدنی من حدیثک یا سعد!

فیضی کا کیا خوب مطلع آپ نے یاد دلا دیا۔ اب بھلانا چاہتا ہوں مگر نہیں بھلا سکتا۔

اے ہم نفسانِ محفلِ ما

رفتید ولے نہ از دلِ ما

کاش خط کی جگہ ہم نشینی و ہم زبانی کا موقعہ نکلتا اگر گزری ہوئی محفلوں کو واپس نہیں لا سکتے تو کم از کم ان کی یاد میں اپنی سوگواریوں کی ایک نئی محفلِ غم تو برپا کر سکتے ہیں۔

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبلِ بیتاب گفتگو کرتے

آپ لکھتے ہیں جو خط صبح، دوران چائے نوشی میں لکھا گیا تھا وہ عین مجلس چائے نوشی میں پہنچا اور پڑھا گیا ـــ سبحان اللہ تشنہ کامانِ محبت کے جاذبۂ شوق کا تصرف۔ جو نامۂ اشتیاق "گرچہ دوریم بیادِ تو قدح می نوشیم" کے عالم میں لکھا گیا تھا، اگر عین بزمِ قدح نوشی میں نہ پہنچتا تو کب پہنچتا؟ امید ہے میرے نفس ہائے سردنے مل کر چائے کے جرعہ ہائے تند و گرم کو گوارا کر دیا ہوگا۔ گوارا تر باد!

مے خور بہ شعرِ بندہ کہ دل تنگیت مباد
بعد از تو خاک بر سر اسباب دنیوی

آپ نے ایک بات کیا خوب لکھی ہے خلوص سدا بہار ہے اور اس ہنگامۂ ہستی میں یہی ایک نعمت ابدی ہے۔ کیا کہوں اس جملہ نے دل پر کیا اثر کیا اس کلمۂ حق کی شرح میرے دلِ دردمند سے پوچھئے۔ اکاون برس کی عمر ہو چکی چند ماہ بعد

باون[52] برس پورے ہو جائیں گے۔گویا انگریزی محاورہ میں کہہ سکتا ہوں کہ پچاس کے "رانگ سائڈ" میں پوری طرح آچکا۔ عام طور پر لوگوں کی ہوش و آگہی کا زمانہ بیس بائیس برس کے بعد شروع ہوتا ہے۔ مبدءِ فیاض کی بخشش خاص نے تیرہ چودہ برس کی عمر ہی میں اس مرحلہ سے مجھے گذار دیا تھا۔ اس طرح گویا ایک کم چالیس برس ہوش و آگہی کے گذر چکے اس چالیس برس کے اندر کارفرمائے غیب کی دستگیریوں نے صدیوں کی مسافتیں طے کرائیں عوت و معنی کا شاید ہی کوئی گوشہ ہوگا جس سے طلب نے تغافل اور آگہی نے پہلوتہی کی ہو اور فکر و عمل کی شاید ہی کوئی بلندی و پستی ہوگی جس کی پیمائش میں قدم نے کوتاہی اور ہمت نے کم جوشی روا رکھی ہو لیکن اگر آپ پوچھیں کہ مدۃ العمر کی اس جہاں نوردی کے بعد زندگی کی حقیقتوں میں سے کیا ہاتھ آیا؟ تو بلا تامل کہونگا کہ دو باتوں کے سوا تیسری بات کہیں دکھائی نہ دی۔ ایک تو یہ کہ زندگی بغیر مقصد کے بسر نہیں کی جاسکتی اس لئے کسی نہ کسی مقصد کی لگن ضرور ہونی چاہیئے۔ دوسری یہ کہ زندگی کے تمام لذائذ

وتمتعات ہیچ ہیں۔ حکایت تشنہ و سراب سے زیادہ نہیں۔ ہاں اگر عیشِ حیات کی یہاں کوئی حقیقت ہے تو صرف اس میں ہے کہ دو دلوں میں اخلاص ومحبت ہو جو لمحے بھی اس کے میسر آجائیں زندگی کا حاصل اور عیش دنیا کا سرمایہ ہے۔

ہر آں کو خاطرِ مجموع ویارِ ہم نشیں دارد
سعادت ہمدمِ اوگشت و دولت ہم قریں دارد

کبھی شب میں چند لمحے فرصت کے میسر آجاتے ہیں تو ریڈیو میں طہران کی مجلس ساز کے چند آہنگ سن لیتا ہوں کہ کامل معنوں میں سرودِ ہمسایہ کے حکم میں داخل ہیں۔ کل رات کو نو بجے طبیعت بہت بے کیف ہو رہی تھی۔ کاغذات کے انبار کو اپنی طبیعت کی طرح پریشان و منتشر چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور ریڈیو کو چھیڑا تو احمد تبریزی لسان الغیب کی یہ غزل اپنے آہنگِ تازہ میں گا رہا تھا۔

زدلبرم کہ رساند نوازش قلمے | کجاست پیکِ صبا گو بیا بکن کرمے
حدیثِ چون و چرا دردسر دہد ساقی | پیالہ گیر دبیاسا بعمرِ خویش دمے

بیا کہ وقت شناسانِ دو کون بفروشند بہ یک پیالۂ صافی و صحبتِ صنمے

وقت کے تصادفات کا کرشمہ دیکھئے بعینہٖ یہی غزل آج سے بتیس برس پہلے ایک بزمِ اُنس میں سنی تھی۔ اور کہاں سنی تھی؟ بغداد کی شبِ ماہ میں عین دجلہ کی لہروں پر۔

عیون المھی بین الرصافۃ والجسر!

مرزا محمد کاظم رشتی نے کہ اعیانِ بوشہر میں سے تھے اور زیورِ فضل و دانش سے محلّٰی اپنی کشتی میں یہ مجلسِ طرب ترتیب دی تھی۔ ایک تازہ وارد مغنی نے کہ مشہدی کے نام سے مشہور تھا عود پر اپنا کمال دکھایا تھا کیا عرض کروں دل پر کیا گذری۔ حافظ کی یہ غزل حسبِ حال اشعار اور بتیس برس پہلے کی بچھڑی ہوئی دنیا کا تصور ایک عجیب عالم طاری ہوگیا عراق کی گذری ہوئی صحبتیں ایک ایک کرکے سامنے آگئیں پچھلی صفیں الٹ چکی تھیں مگر پھر بھی خال خال اصحابِ فضل و کمال موجود تھے۔ جن کے سانچے اب موجودہ دنیا کی مٹی سے نہیں ڈھالے جا سکتے۔ شیخ العصر محمود شکری، آلوسی زادہ، شیخ ابو حمزہ کردی،

سید عبدالرحمٰن نقیب، سید فضل اللہ اصفہانی، شاعرِ عراق جمیل صدقی الزہاوی، سید صدرالدین عاملی، سید محمد کاظم طبا طبائی، اخوند ملا محمد کاظم خراسانی، مرزا محمد حسین دانش، ان میں سے ہر فرد اپنی اپنی خصوصیات میں فرد تھا افسوس ایک ایک کر کے سب رخصت ہو گئے وہ کیا رخصت ہوئے اس عہد کی ساری باتیں ہی خواب و خیال ہو گئیں۔ ہا! کیا زمانہ تھا، اور کیا اس عالمِ رنگ و بو کی جلوہ طرازیاں تھیں میری عمر بیس اکیس برس کی ہو گی۔ عہدِ شباب کے دلولوں سے دل کا ایک ایک ریشہ معمور تھا، جس منظر کو دیکھتا تھا، جنت نگاہ تھا، جس نوائے ہستی کو سنتا تھا۔ فردوس گوش تھی۔ عراق کے قیام کے یہ چند مہینے اب چند لمحوں سے زیادہ محسوس نہیں ہوتے۔

شھور ینقضین وما شعرنا ——— بانصاف لھن ولا سرار!
فما لیلھن فخیر لیل ——— واطیب ما یکون من النھار!

اس کے ابتدائی دو شعر بھی آپ کو یاد دلا دوں کہ کسی نے نوکِ نشتر سے صفحۂ دل پر کھود دیئے ہیں۔

اقول لصاحبی والعیس تھوی ——— بنا بین المنیفۃ فالضمار

تمتع من شمیم عرار نجد   فما بعد العشیۃ من عرار

دیکھئے رشتۂ خیال کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔ ان شعروں نے حضرت شیخ آلوسی زادہ رحمۃ اللہ علیہ کی یاد پھر تازہ کردی۔ میں نے علوم عربیہ میں ان سے بڑھ کر کسی کو صاحبِ رسوخ و احاطہ نہیں پایا۔ ادب عربی کے حافظ بھی تھے اور ناقد بھی تھے تاج سبکی نے طبقات میں امام ذہبی کی نسبت جو کچھ لکھا ہے۔ وہ ادب عربی کے معاملہ میں ٹھیک ٹھیک ان پر راست آتا تھا۔ وھو رجل الرجال فی کل سبیل. کانما جمعت الامۃ فی صعید واحد فنظرھا! ایام واشعار عرب کی پوری دنیا ان کے دماغ میں سمٹ آئی تھی جس گوشے کو جب چاہتے تھے دیکھ لیتے تھے۔ ایک دن مجلس مذاکرہ میں ان اشعار کا تذکرہ ہوا میں نے عرار نجد کی نسبت سوال کیا فوراً نو اشعار مختلف شعرا اور عہدوں کے سنا دئے جن میں عرار کا ذکر کیا گیا ہے۔ دیوان سے اٹھے تو شیخ ابو حمزہ نے کہ حماسہ کے حافظ تھے راستہ میں کہا ہماری ساری عمر اسی وادی میں بسر ہو چکی ہے لیکن دو شعر سے زیادہ

حافظہ ہیں نہ تھے تم نے دیکھا شیخ کے نظر و احاطہ کا کیا حال ہے۔
یہ وہی بزرگ ہیں جنھوں نے اورنٹیل کانگرس کی فرمائش
سے عرب جاہلیۃ کی مبسوط تاریخ تین جلدوں میں لکھی تھی۔
بلوغ الادب پہلے بغداد میں چھپی تھی پھر مصر میں بھی چھپ گئی
ان ہی کے بھائی شیخ نعمان آلوسی زادہ تھے جنھوں نے
جلاء العینین فی محاکمۃ الاحمدین لکھی اور نواب صدیق حسن خاں مرحوم
نے مصر میں چھپوائی۔ ان کے والد شیخ شہاب آلوسی مفتی بغداد
کی تفسیر روح المعانی مشہور ہے۔

ان کے خاندان سے میرے خاندان کا پہلا رشتہ کچھ عجب
طرح کے حالات میں قایم ہوا تھا۔ والد مرحوم جب ۱۲۹۳ھ
میں عراق گئے تھے تو سید عبدالرحمن نقیب مرحوم کے والد
سید علی رحمۃ اللہ علیہ سجادہ نشین تھے۔ ان ہی کے یہاں ٹھیرے
شیخ آلوسی کا انتقال ہوچکا تھا مگر ان کی مصنفات کے قلمی نسخے
سید کے خانداں میں متداول تھے اور بڑی عزت و احترام کی
نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ سید مرحوم نے شیخ کی تفسیر روح المعانی

بڑے فخر و مباہات کے ساتھ دکھائی کہ ہمارے شیخ کی تصنیف ہے۔ شیخ آلوسی اگرچہ بظاہر شاہراہ عام سے الگ نہیں ہوئے تھے کہ عہدۂ افتا اور رجوع عام کا علاقہ دامن گیر تھا مگر دراصل سلفی المشرب تھے اور تقلید کی بندشیں بہت کچھ ڈھیلی ہوچکی تھیں۔ چنانچہ تفسیر میں کہیں کہیں اس کی جھلک صاف نظر آجاتی ہے والد مرحوم حنفیت اور اشعریت میں بڑے ہی شدید تھے ان کی نظر اس معاملہ میں کب چوکنے والی تھی۔ ایک دن عین مجلس دیوان میں کہ شیخ نعمان آلوسی زادہ بھی موجود تھے سید علی مرحوم نے پوچھا آپ نے شیخ کی تفسیر کو کیسا پایا؟ والد مرحوم نے بلا تامل کہا خوب ہے مگر کہیں کہیں وہابیت اور اعتزال کی بو مجھے محسوس ہوئی۔ یہ بے پردہ ایراد تمام مجلس پر گراں گذرا خصوصاً شیخ نعمان پر، اور صحبت نے مجلس مباحثہ کا رنگ اختیار کرلیا۔ شیخ آلوسی نے حیات خضر سے انکار کیا ہے۔ والد مرحوم نے سب سے پہلے اس کا تعقب کیا پھر تفسیر کے تمام ایسے مقامات ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالے اور

ایک رسالہ تعقبات میں تصنیف کر کے شیخ نعمان کو بھیجا۔ شیخ نے اس کے جواب میں ایک مکتوب لکھا، والد مرحوم نے جواب الجواب لکھ کر اس مکتوب کو بھی مع اپنے جواب کے رسالہ کے آخر میں شامل کر دیا۔

مرحوم سید عبدالرحمٰن نقیب نے مجھے وہ اطاق دکھایا تھا جہاں والد مرحوم بیٹھ کر لکھا کرتے تھے نیز حرم کا وہ حصہ جہاں والدہ مرحومہ ٹھیری تھیں والد مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا اصل رسالہ بھی روح المعانی کے قلمی نسخہ کے ساتھ کتب خانہ میں موجود تھا۔

سید مرحوم کے تفرس نے پہلی ہی ملاقات میں تاڑ لیا تھا کہ میرے خیالات کی رفتار دوسری ہے مجھے دوسرے دن شیخ سے ملایا تو یوں تقریب کی کہ تمھیں شیخ خیرالدین ہندی یاد ہیں جنھوں نے شیخ کبیر (یعنی شیخ آلوسی) کی تفسیر پر تعقبات کئے تھے یہ ان ہی کے فرزند ہیں لیکن مجھے ان سے وہی بو آئی جو ان کے شیخ نے تمھارے شیخ کی تفسیر میں سونگھی تھی۔

کیا عرض کروں کس محبت و شفقت کے ساتھ ملے تھے۔ معانقہ کیا۔ پیشانی چومی۔ میں نے حجاز کے آداب تعظیم کے مطابق کہ بچپن سے اپنے گھر میں اس کا عادی ہو گیا تھا، انکے گھٹنوں کو بوسہ دینا چاہا تو فوراً گھٹنے ہٹا لئے اور باز رکھنے کے لئے پکڑ لیا۔ اس کشمکش میں سر تو ان کے گھٹنوں پر نہ پہنچ سکا۔ لیکن پگڑی ان کے قدموں پر گر گئی اور بے اختیار حافظ کا شعر یاد آ گیا۔

اے خوش آں عاشقِ سرمست کہ بر پائے حبیب
سر و دستار نہ داند کہ کدام انداز د

بار بار فرماتے تھے "من این اخذت هذا المشرب" ہمیں یہ راہ بزرگوں سے ملی اور چل کھڑے ہوئے تمھیں تو خود ڈھونڈھ کر سراغ لگانا پڑا۔

والد مرحوم نے کئی بار عود کا عطر شیخ لقمان مرحوم کو بھیجا تھا۔ انھیں یہ بات یاد تھی، مجھے دیکھتے تو فرماتے عود مندل کی خوشبو تم سے آتی ہے۔ (یہ "مندل" کارومنڈل کی تعریب ہے

کہ ہندوستان کا جنوبی ساحل اس نام سے مشہور تھا)
۱۹۱۲ء میں میں نے جب الہلال نکالا تو انھیں نہیں بھیجا
کہ اردو کا پرچہ کیا بھیجوں لیکن مصر کے اخبارات میں جب اس کا
ریویو ان کی نظر سے گذرا تو مجھے شکایت کا خط لکھا۔ سرنامہ
ابن الفارض کا یہ مطلع تھا۔

قلبی یحدّثنی بانک متلفی
روحی فداک عرفت ام لم تعرف

دیکھئے آپ کی صدائے دل نوازنے دل ہزار شورش کے ساتھ
کیا کیا، جدید آداب مکاتبت سے قطع نظر کر کے کاغذ کے دونوں
صفحے سیاہ کرتا رہا پھر بھی پانچ ورق ختم ہو چکے اور شوق مخاطبت
ہے کہ رکنے کا نام نہیں لیتا۔

بہ صد دفتر نمی گنجد حدیث درد مشتاقے

ہر چند چاہتا ہوں قلم روکوں مگر روک نہیں سکتا دماغ سینما
کا پردہ بن گیا ہے ایک تصویر ہٹتی ہے تو دوسری نمودار
ہو جاتی ہے۔ جی چاہتا ہے صحبت ختم نہ ہو ایک ذکر ختم ہو جائے

تو دوسرا چھیڑ دوں۔

قدرے گریم وہم بر سرِ افسانہ روم

دیکھئے کب ملاقات ہوتی ہے۔ وقت کے سیاسی حالات ایسے ہو رہے ہیں کہ کہہ نہیں سکتا کل کیا صورت پیش آ جائے اگر حالات کی رفتار ایسی نہ ہوتی تو یقین کیجئے دل آرزومند کی شورشوں کا یہ حال ہے کہ کلکتہ سے اٹھتا اور سیدھا بھیکم پور پہنچ کر آپ سے بغل گیر ہوتا

وابرح ما یکون الشوق یوماً

اذا دنت الخیام من الخیام

ملا صاحب کے سلام شوق سے بہت جی خوش ہوا۔ میرا بھی سلام انھیں پہنچائے اور ان کے حافظہ کی داد دیجئے۔ صفحہ ختم ہو گیا ورنہ اس دو بجے کے دودھ کی سرگذشت سناتا۔

والسّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ‘

ابوالکلام

حبیب گنج - علی گڈھ
۱۳ر اکتوبر ۱۹۴۰ء

مکرم حبیب[1] السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'
صحیفۂ ثانیہ (تذکیر رر) کا شکر مکرر - ڈرتا ہوں کہ مبالغہ نہ سمجھا جائے، پھر کہتا ہوں کہ میں سچ کہتا ہوں اور سچ کے قدر دان کے سامنے کہتا ہوں پھر ڈرنا کیسا - آپ نے یہ خط لکھ کر دل میں ایک عالم پیدا کر دیا کیا کہوں، ایک بار پڑھا اُسی صحبت میں دوبارہ پڑھا، تیسری مرتبہ آواز سے پڑھا، ایک نکتہ سنج ادیب[1] کو سنایا، ہر بار کے پڑھنے میں یہ عالم تھا کہ دل کسی مخلص کے معانقے کی گرمی کا لطف محسوس کر رہا تھا، آنکھیں پرنم تھیں، چوتھی مرتبہ اس وقت پڑھا کہ جواب لکھنے بیٹھا ہوں - گرمیٔ تحریر کی تاثیر دیکھیے کہ آپ کے ہر واقعہ نے جو زیبِ قلم ہوا مجھ کو بھی اُسی کے مطابق دلفروز واقعہ یاد دلا دیا -

---

[1] ماسٹر سید مظہر علیم فرید آبادی بی - اے مرحوم، جلیس نواب صدر یار جنگ بہادر - ۱۲ -

شروع میں یہ شعر زیبِ رقم ہوا ؎

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبلِ بیتاب گفتگو کرتے

مجھ کو یاد آیا کہ علی حزیں نے لکھا ہے کہ ایک موقعہ پر جب اُن کا دل محبت کا نشتر خوردہ تھا ایک شب اصفہان کی کسی صحبت میں جو باغ میں تھی علی کو ساری نے ساز درست کرکے یہ شعر سنایا ؎

امشب بیا تا درچمن سازیم پُر پیمانہ را
تو شمع و گل را داغ کن من بلبل و پروانہ را

صبح تک یہ ہی نغمہ تھا۔ اس شعر کو گاتا، چپ ہو جاتا پھر گاتا پھر چپ ہوتا۔ حزیں کہتا ہے کہ معلوم نہیں کتنی مرتبہ سلطانِ روح نے قالب خالی کیا تھا۔ میں نے جس عالم میں یہ واقعہ پڑھ کر لطف لیا تھا وہ آپ کے شعر بالا سے تازہ ہو گیا۔

آپ نے بغداد کا ذکر چھیڑا مجھ کو وہ وقت یاد آگیا جب دو نوجوان ابوالکلام آزاد و ابوالنصر آہ نمایاں ہوئے تھے۔

امرتسر سے وکیل اخبار منشی غلام محمد مرحوم کی ادارت میں شان وقار کے ساتھ نکلتا تھا اُس میں آپ کے مضامین ہوتے تھے۔ جو اُس وقت بھی لطف کلام اور خوبی معانی کے جوہر سے آراستہ ہوتے تھے اُسی سلسلہ میں یہ سنا کہ آپ بغداد چلے گئے۔ بغداد کی روئداد آپ نے اب سنائی۔

ریڈیو نے احمد تبریزی کا آہنگ تازہ سُنا کر آپ کو یاد بغداد میں محو کر دیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ حافظ کی جس غزل

نہ دلبرم کہ رساند نوازش قلمے

کے ریڈیو پر سننے سے ۳۲ برس اُدھر کی صحبت آپ کو یاد آئی اُسی غزل نے مجھ کو کیا یاد دلایا۔ آپ نے اس غزل کے تین شعر نوازش نامے میں نقل کئے تھے میں نے پوری غزل دیکھنے کے لئے حافظؒ کا دیوان نکلوایا وہ نسخہ ہاتھ میں آیا جو ملک التجار نے ایرانی خط میں چھاپا تھا۔ آج سے چالیس برس پہلے یہ نسخہ زیر مطالعہ رہا تھا۔ جابجا انتخاب کے نشان کئے تھے۔ اب جو یہ غزل نکالتا ہوں تو اس پر انتخاب کا نشان موجود پاتا ہوں۔ دل پر

اس توارد و تصادف سے عجب عالم طاری ہوا۔ آپ کو دجلہ کی مواجی اور شب ماہ کی تابش یاد آئی، مجھ کو خود اپنی طبیعت کی مواجی اور تلاطم نے بے تاب کر دیا۔ کیا کہوں کیا عالم تھا اور کس کے اثر سے تھا اجمالاً اس عالم کی شرح نگار ایک غزل ہے جو اسی کیف میں موزوں ہوئی تھی ؎

زجامِ لعل تو مستم شراب راچہ کنم
خوشم بسوزِ دلِ خود کباب راچہ کنم

یہ مطلع خواجہ آصفی کا ہے۔ اسی طرح پر میں نے غزل عرض کی تھی ؎

زچشمِ مستِ تو مستم شراب راچہ کنم
زتابِ حسنِ تو سوزم کباب راچہ کنم

حدیثِ دوست بگوشم رسد زپردۂ دل
حکایتِ نئے وصوتِ رباب راچہ کنم

نہ کردہ جلوہ بتِ شوخ و باختم دل و دیں
اگر برافگند از رُخ نقاب راچہ کنم

حسب عادت غزل علامہ شبلی مرحوم کے ملاحظہ میں پیش کی گئی۔ حیدر آباد سے ۱۹ دسمبر ۱۹۱۰ء کو تحریر فرمایا "خدا کی قسم غزل کی غزل مرصع ہے اور یہ شعر تو دل میں رکھ لینے کا ہے۔ اگر برافگند از رخ الخ"

دیکھئے ۳۲ اور چالیس برس کے گذرے ہوئے دو واقعے کس طرح متصادف ہو گئے۔ یہ خلوصِ ذوق کا کرشمہ ہے۔ آپ کو بہت سے اہلِ کمال یاد آئے تھے مجھ کو ایک علامہ کی یاد نے محوِ ذوق بنا دیا ؎

ولیس للہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد

رحمت باد بر شبلی۔ نعمت بر آزاد

حدیثِ تازہ گوییم

چوتھا یا پانچواں دن ہے ایک شب کو تراویح کے بعد عنبری سبز چائے کا دور تھا۔ چند ہم مشرب جمع تھے۔ مُلّا صاحب بھی تھے لسان الغیبؒ کو زحمتِ قدوم دی گئی۔ سرورق غزل نکلی ؎

معاشراں گرہ از زلف یار باز کنید

شبے خوش ست بدیں وصلہ اش دراز کنید

(دیکھئے زلف معنبر اور چائے عنبری کا وصلہ کیا خوب ہوا۔ شب کی خوشی دوبالا ہوئی)

حضور خلوت انس ست و دوستاں جمع اند و ان یکاد بخوانید و در فراز کنید

نخست موعظۂ پیر صحبت ایں حرف است
کہ از مصاحب ناجنس احتراز کنید

برآں کسی کہ دریں حلقہ زندہ نیست بعشق
بروُ چو مُردہ بفتوائے من نماز کنید

غزل مکرر پڑھی گئی۔ حیرت تھی کہ لسان الغیبی کا پورا جلوہ دکھارہی تھی۔ تراویح کے بعد دوسری نماز کا فتویٰ خاص لطف دے گیا۔

جو گناہ آپ سے سرزد ہوا تھا میں نے عمداً اُس کا ازتکاب کیا دونوں صفحے بھردئے۔ کاغذ کا قحط ہے۔ کلکتہ کی ایک تعمیل کنندہ فرم دانت دکھا گئی۔

ملا صاحب کے سلام پر ختم کلام۔ مگر صد سخن باقی۔

حبیب الرحمٰن

۱۹ اے بالی گنج سرکلر روڈ۔ کلکتہ
۲۶ر اکتوبر ۱۹۴۰ء

صدیق مکرم تعلیقہ گرامی میں صرف الفاظ ہی نہ تھے، خوشبو بھی تھی، آنکھیں سوادِ خط سے خورسند ہوئیں۔ دماغ نے محبتِ بے ریا اور خلوصِ اہل صفا کا عطر سونگھا۔ انفلوئنزا کی شدت سے سر قابو میں نہ تھا جسم بے حال ہو رہا تھا۔

زبیتابی سرم میگردد و بالیں نمی باید

مگر آپ کی صدائے محبت نے اٹھا کر بٹھا دیا۔ اب تکیہ کے سہارے یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔

زنسیمِ جانفزایت دل مردہ زندہ گردد
زکدام باغی اے گل کہ چنیں خوش ست بویت

آپ نے شیخ علی حزیں کا واقعہ کیا خوب یاد دلایا اسی عالم میں اس نے غزل لکھی تھی۔

بجرمِ عشق اگر کشتی مرا ممنونِ احسانم گناہِ زاہد بیدرد یارب چیست حیرانم

کتاب عشق لوح دل بود درکتب ہستی نکو کردی بسطر تن کشیدی خط بطلانم

شیخ کو سوز و تپش کی جو دولت ایک شب میسر آئی تھی، الحمدللہ اس نامراد کا دامنِ نیاز اس سے مہینوں سرمایہ اندوز رہا بلکہ کہنا چاہیئے کم و بیش دو سال تک اسی عالم میں زندگی بسر ہوئی تھی ؎

اے برق تو ذرا کبھی تڑپی ٹھہر گئی
یاں عمر کٹ چکی ہے اسی اضطراب میں

اس زمانے میں سماع کی کیفیتوں اور شورش انگیزیوں کے جو واردات و سوانح تجربے میں آئے بقول شیخ کے سرتا سر حالی ہیں۔ زبانِ حرف و صوت ان کی متحمل نہیں ہو سکتی بسا اوقات ایسا ہوا کہ کسی راہ چلتے فقیر کی ایک صدائے خوش ہی کام کر گئی اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ آگرہ میں گذر ہوا، موسم بہار کا آغاز تھا اور چاندنی راتیں تھیں ایک دن شام کو جمنا پار کے ایک گوشۂ چمن میں بعض یارانِ ہمدم جمع ہوئے اور تمام شب صحبتِ سوز و ساز جاری رہی، ابتدا میں چند چیزیں ہندی اور اردو

کی زبانِ نغمہ پر رواں ہوئیں مگر دل کی بیتابیوں کو جوش و خروش میں نہ لا سکیں۔ ناگاہ امیر خسروؒ کا یہ مطلع پردۂ ساز میں بہ ہزاراں دلکشی و رعنائی زمزمہ پرداز ہوا۔

جان زتن بردی و در جانی ہنوز

دردہا دادی و درمانی ہنوز

کیا کہوں اور کیونکر کہوں کہ بجز دسماع کیا عالم طاری ہو گیا تھا یہ مطلع بارہا پڑھنے اور سننے میں آچکا تھا مگر اس وقت ایسا معلوم ہوا گویا زندگی میں پہلی مرتبہ گوش زد ہوا ہے اور اس کے صاف صاف لفظوں میں جو صاف معانی پوشیدہ ہیں ان کی حقیقت کا پہلی مرتبہ انکشاف ہوا ہے شیخ نے جو کچھ لکھا ہے انشا پردازی نہیں ہے، حقیقتِ حال ہے۔ روح نے بارہا کالبدِ خاکی کو خالی کرنا چاہا مگر پھر اٹک کر رہ گئی۔ باوجودیکہ ایک قرن سے زیادہ زمانہ گذر چکا ہے۔ مگر جو چولھا اُن وقتوں میں گرم ہوا تھا آج تک ٹھنڈا نہیں ہوا، انگارے بجھ چکے ہیں مگر خاکستر کریدی جائے تو اب بھی چنگاریاں نکل آئیں گی اس سے

زیادہ آپ کو کیا لکھوں کہ الحمد للہ اس کوچے کے رسم و راہ سے آشنا اور اس دولت معنوی کی بخششوں سے سرمایہ اندوز رہ چکے ہیں والعیان لا یحتاج الی الشرح والبیان۔

ومن بعد ھذا مایدق بیانہ
وما کتمہ احظی لدیہ واجمل

آپ نے اپنی زندگی کے بعض واردات وسوانح کی طرف جو اشارہ کیا ہے وہ مزید کیف و ذوق کا باعث ہوا اور اسی کی تحریک سے مندرجہ بالا سطور بے اختیار نوک قلم پر رواں ہوگئیں ورنہ اس باب میں تکلم وحکایت اصحاب درد و ذوق کا شیوہ نہیں۔ شاہ ابو المعالی رحمۃ اللہ علیہ شاعر نہ تھے مگر ایک شعر کیا خوب کہہ گئے ہیں کہ شاہ عبدالحق محدث کے ورد زبان ہوگیا تھا۔ مکاتبات میں بار بار نقل کرتے ہیں۔

سخن عشق بدل ورنہ و لب را مکشا
سر ایں شیشہ فرو بند کہ بادے نہ خورد

"سر ایں شیشہ فرو بند" میں کیا قیامت کر گئے ہیں۔

شیخ کے تذکرہ نے اپنی طبیعت کا ایک خاص تاثر یاد دلا دیا۔ میں نے جب پہلے پہل ان کی خود نوشتہ سوانح عمری پڑھی تھی تو ان کے اوضاع و روش سے طبیعت بے حد متاثر و مالوف ہوئی تھی اور ایک طرح کا خاص لگاؤ پیدا ہو گیا تھا، زمانے کی کوئی ناموافقت ان کے علوِ طبع، عزتِ نفس، اور خودداری و نامرادی پر غالب نہ آسکی۔ یہ اوصافِ حمیدہ اگرچہ بحدِ غرور و کبر پہنچ جائیں، بہر حال ذلّتِ نفس، اور دنائتِ طبع کے خصائلِ رذیلہ سے بدرجہا افضل و ارجح ہیں۔ آپ کو شاید یہ سن کر تعجب ہو کہ شیخ نے ہندوستان اور اہلِ ہند کی ہجو میں جو کچھ کہا تھا مجھے اس کا بھی کوئی گلہ نہ تھا۔

نسناس سیرتی ست تمنائے مردمی
از دیو لاخ ہند کہ آدم نداشتہ ست

اب بھی دیکھتا ہوں تو طبیعت میں یہ تاثر بدستور باقی ہے۔ شیخ کے متعدد رسائل ہاتھ آئے جن کا تذکرہ میں ذکر کیا ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کا پایہ حکمت و معقولات میں بلند تھا۔

اور طبیعت مجتہدانہ نظر و کاوش سے بھی خالی نہ تھی۔ سراج الدین علی خاں آرزو شمس الدین فقیر اور ٹیک چند بہار وغیرہم کے ان سے معاملات حکایتِ زاغ و بلبل کا حکم رکھتے ہیں۔

آپ کی غزل پر علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی تحسین بڑی سی بڑی سند ہے جو اس عہد میں مل سکتی تھی یہ شعر کتنا رواں اور ڈھلا ہوا نکلا ہے۔

حدیثِ دوست بگوشم رسد ز پردۂ دل
حکایتِ نئے و صوت رباب را چہ کنم

اور نقاب کے قافیہ میں تو واقعی ردیف چیخ اٹھی ہے۔

اگر برافگند از رخ نقاب را چہ کنم

علامہ مرحوم کی یاد میں آپ کو کتنا برمحل شعر یاد آیا۔

ولیس للہ بمستنکر   ان یجمع العالم فی واحد

خواجہ حالی مرحوم نے کیا خوب کہا ہے۔

بہت لگتا ہے جی صحبت میں ان کی
وہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں

فی الحقیقت مولانا مرحوم کی ذات نبوغ و کمال کے رنگا رنگ مظاہر کا ایک عجیب مجموعہ تھی اور جیسا کہ فارسی میں کہتے ہیں۔ سر تا سر مغز بے پوست تھی۔ بہ مشکل کوئی مہینا ایسا گذرتا ہے کہ دو تین مرتبہ ان کی یاد ناخن بدل نہ ہوتی ہو وہ کیا گئے علم و فن کی صحبتوں کا سر تا سر خاتمہ ہوگیا۔ مولانا مرحوم سحر خیزی کے عادی تھے والد مرحوم کی سحر خیزی نے مجھے بھی بچپن سے اس کا عادی بنا دیا ہے۔ اس اشتراک عادت نے ایک خاص رشتۂ انس پیدا کر دیا تھا، جب کبھی یک جائی ہوتی تو صبح چار بجے کا وقت عجیب لطف و کیفیت کا وقت ہوتا۔ چائے کا دور چلتا اور علم و فن اور شعر و ادب کے چرچے رہتے۔ ہر وادی میں وہ اپنے ذوق و فکر کی ایک خاص اور بلند جگہ رکھتے تھے اور یہ کتنی بڑی خوبی تھی کہ باوجود ملّایانہ طلب علم کے ملائیت کی پرچھائیں بھی ان پر نہیں پڑی تھی۔ خشکیٔ طبع جو اس راہ کے مہالک و آفات میں سے ہے انھیں چھُو بھی نہیں گئی تھی۔ شاعری کے ذوق و فہم کا جو اعلیٰ مرتبہ

ان کے حصہ میں آیا تھا اس کی تو نظیر ملنی دشوار ہے۔ ہندوستان میں فارسی شاعری غالب پر نہیں اُن پر ختم ہوئی کئی مرتبہ مجھے خیال ہوا کہ اگر وہ شاعری پر پوری طرح متوجہ ہوتے تو اُن کا وزن شعر فارسی میں غالب سے کسی طرح کم نہ ہوتا۔ پھر غالب جو کچھ ہے تغزل و مدح کے محدود میدانوں میں ہے۔ لیکن مولانا نے فارسیت کے ذوق اعلیٰ کے تحفظ کے ساتھ فکرو تخیل کے نئے نئے میدان پیدا کئے جن پر ان کی قومی نظمیں گواہ ہیں، خصوصاً حیدرآباد والی نظم، اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ مولانا تنہا شاعر ہیں جنھوں نے فارسی شاعری کو اس کے اسلوب شعریت کے تحفظ کے ساتھ نئے میدانوں سے آشنا کیا۔ اس معاملہ کی حقیقت اس وقت منکشف ہوتی ہے جب ایران کے نئے قومی شاعروں کے مہملات پڑھے جائیں جن کی ترتیب واشاعت میں غریب براؤن نے اس قدر زحمتیں برداشت کی تھیں۔ آج کل ایران کے ملک الشعراء بہار ہیں خدا ان کے کلام کے مطالعہ کی بدمزگی سے محفوظ

رکھے۔

غزل میں تو یقیناً مولانا کے یہاں غالبؔ سے کہیں زیادہ سرجوشی و کیفیت ہے اور حقائق و واردات کے لحاظ سے تو مقام ہی دوسرا ہے۔ مولانا کا ایک شعر سینکڑوں مرتبہ دہرا چکا ہوں لیکن پھر بھی بے اختیار دل کی گہرائیوں میں سے اُبھر آتا ہے۔

دو دل بودن دریں رہ سخت تر عیبیست سالک را
خجل ہستم ز کفر خود کہ دارد بوئے ایماں ہم

میں جانتا ہوں کہ یہ شعر مولانا ہی کہہ سکتے تھے کیونکہ اس کا تعلق ایک خاص حالت سے ہے جب تک وہ طاری نہ ہو، اس طرح کی صدا اُٹھ نہیں سکتی۔ خواجہ حالیؔ مرحوم نے مجھ سے فرمایا تھا کہ اس شعر پر گھنٹوں مجھے خود فراموشی رہی۔

افسوس اب وہ وقت آگیا کہ ان تذکروں کے لئے بھی کوئی مخاطب نہیں ملتا۔ کہاں جائیے اور کس سے باتیں کیجئے۔ جن سے خطاب تھا وہ سب رخصت ہو گئے۔ ہاں الحمد للہ ایک

آپ کی ذاتِ گرامی باقی ہے لیکن یک جائی میسر نہیں۔

سراغ یک نگاہ آشنا درکس نمی یابم
جہاں چوں نرگستاں بے تو چشم کور می ماند

بدایونی نے ایک رباعی لکھی ہے۔ معلوم نہیں کس کی ہے اکثر زبان پر جاری ہو جاتی ہے۔

افسوس کہ یاراں ہمہ از دست شدند
در پائے اجل لگاں لگاں پست شدند
بودند تنک شراب در مجلس عمر
یک لحظہ زما پیشترک مست شدند

اب تھک گیا ہوں اور تکیہ پر سر رکھتا ہوں۔ ملا صاحب کو بعد سلام کہئے کہ کونین کی گولیاں سامنے دھری ہیں مگر افسوس آپ نہیں ہیں کہ رات کے دو بجے حلوائی کے یہاں کا دودھ پلائیں۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

ابوالکلام

حبیب گنج۔ علی گڈھ

۶؍دسمبر ۱۹۴۰ء

مکرم حبیب صدیق حمیم۔ السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

۲۶؍اکتوبر کا گرامی مکتوب برابر پیش نظر بلکہ نور نظر رہا۔ بار بار دیکھا۔ اس وقت بھی پڑھ لیا۔ دو یادیں تازہ ہوئیں بلکہ تین ایک عالم سوز وگداز کی۔ حکم ہے "سراین شیشہ فروبند" لہذا اسی قدر اشارہ کافی ہے۔ دوسری شیخ علی حزیں کی۔ میرا خیال آپ کے خیال کے ساتھ طابق النعل بالنعل ہے۔ کجا حزیں کجا حزیں کے معترضین اہل ہند کو برا کہا تو کہا

ع۔ ہنر کے دیکھنے والے ہنر کو دیکھتے ہیں

شعر العجم میں علامہ مرحوم نے شیخ کو نہیں مانا۔ میں نے ٹوکا۔ ایک بار سے زیادہ بنارس میں مزار شیخ دیکھا ہے اور اس کو غزل فارسی کا مدفن محسوس کیا ہے۔ تیسری یاد علامہ شبلی مرحوم کی آپ کے پُرشوق الفاظ نے آتش شوق تیز کر دی۔ اسی زمانہ میں ایک طُرفہ

اتفاق پیش آیا۔ مدت دراز کے بعد رباعیات سحابی نجفی کا ایک عمدہ قلمی نسخہ ہاتھ آگیا۔ رباعیات کے متعلق تلاش شروع ہوئی کسقدر رہیں۔ کہاں کہاں ہیں کسی نے یاد دلایا کہ ستمبر ۱۹۳۷ء میں الندوہ میں مولانا نے ایک مضمون سحابی پر شائع کیا تھا الندوہ دیکھا اسی ضمن میں ایک دوسرے مضمون میں ایک دو آتشہ جام نگاہ شوق میں چھلک گیا۔ آثار رحیمی کے طبع ہونے کا شوق ظاہر فرمایا گیا ہے۔ اس ضمن میں چار نام زبانِ قلم پر آئے چوتھا نام میرا تھا' اس عنوان سے "حبیب صادق" جوش کیف میں جھوم گیا۔ حضرت میر دردؒ کا شعر یاد آیا کیف دوبالا ہوگیا ؎

دونوں جہان کی نہ رہی پھر خبر اُسے
دو پیالے جس کو آنکھوں نے تیری پلا دیئے

مولانا کے دونوں لفظ دو پیالے تھے' بلکہ دو خم' نہیں دو میخانے' آج تک جب یاد آتے ہیں سرشارِ نیاز کر دیتے ہیں ؎

من شیشہ بدل دارم پیمانہ بدل دارم
قربانِ نگاہِ تو میخانہ بدل دارم

شبلی کی نگاہ! دل مستِ ذوق کیوں کر نہ ہو۔ رحمت الٰہی بڑے آپ نے گرامی نامے میں حضرت امیر خسروؔ کا ایک شعر واقعہ آگرہ کے ضمن میں لکھا ع

جاں زتن بردی و در جانی ہنوز

دیکھئے ذوق میں ذوق، بات میں بات، نواب اسحٰق خاں مرحوم کے دورِ سکرٹری شپ میں جو اہتمام کلام خسروؔ کے اشاعت کا ہوا تھا اس کا سلسلہ اب پھر جاری کیا ہے، کچھ فنڈ باقی تھا، پہلے مثنویاں شائع ہوئیں، دیوان نہ ہوا اب وسط الحیوٰۃ کو ہاتھ میں لیا ہے مصحح نے چند جزو صحیح کر کے دیئے ہیں وہ ان دنوں ذوق آفریں ہیں۔ اتفاقیہ چند معاشر بھی ہیں، شب کو ایک وقت کچھ کلام پڑھا سنا یا جاتا ہے۔ ایک غزل پڑھی گئی، چھوٹی بحر کی مگر سوز و گداز کا بحرِ بے پایاں دو تین شعر سن لیجئے مقطع کا اخیر مصرع معلوم نہیں کتنی بار پڑھ چکا ہوں ہر مرتبہ دل بحرِ نیاز میں غوطہ کھا جاتا ہے اور تازہ دم ہو کر ابھرتا ہے۔

دیوانہ شدم در آرزویت — اے چشم ہمہ جہاں بسویت
ما ئیم و تحیّر و خموشی — و آفاق ہمہ بگفتگویت
دی روئے تو دیدم و نمردم — شرمندہ بماندہ ام زرویت
خسرو بکمند تو اسیر ست — بیچارہ کجا رود زکویت

اللہ اکبر۔ بیچارہ کجا رود زکویت۔ زمانہ پلٹے کھا رہا ہے۔ انقلاب کے سیلاب موج زن ہیں۔ صحبتیں درہم برہم ہو رہی ہیں۔ دستِ اجل کار فرما ہے۔ جو رونقِ بزم اور نورِ چشم تھے زیر خاک جا سوئے اس پر بھی سر سودا زدہ اپنے خیال میں ہے، شبلی سے باتیں کرتا ہے، شوقِ نیاز کو بدستور تازہ پاتا ہے علیٰ ہذا القیاس جو احباب چلے گئے ہنوز سر سودا زدہ اور قلب دیوانہ ان کی حضوری محسوس کر رہا ہے ان سے جن چیزوں کو تعلق تھا وہ اب بھی ویسی ہی عزیز ہیں جیسی ان کی حیات میں تھیں۔ خلاصۂ کلام۔ دائرہ اخلاص میں بدستور گام زن قدم فرسا ہے۔ کوئی ٹوکتا ہے تو چیخ اٹھتا ہے۔
"بیچارہ کجا رود زکویت"

یہ ہے بیچارگی کی قوت! تاکرا دہند
درازہ آہنگی معاف۔ آپ کا محبت نامہ پڑھوں محبت کی باتیں
سنوں اور پھر قلم قابو میں رہے" ایں خیال ست ومحال ست وجنوں"
ثم وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"
جوشِ شوق نے معذرت تاخیر جواب نہ لکھنے دی۔ یہ انتظار
رہا کہ سفر سے مع الخیر مراجعت ہو تو لکھوں۔ الحمدللہ خبر
بخیر رسی کلکتہ پڑھی۔ جواب عرض کر دیا۔

حبیب الرحمٰن

دہلی
۱۹ر فروری ۱۹۴۲ء

وفا کنند کہ بیگانہ آشنا گردد
ترا چہ شد کہ نمی پرسی آشنائے را

ابوالکلام

حبیب گنج۔ ضلع علی گڑھ

مورخہ ۲۳ فروری ۱۹۴۲ء

حبیب نواز آشنا پرور کرم طراز۔ السّلام علیکم وقلبی لدیکم

کل جان پرور نامہ پہنچا۔ دیکھ کر دل فرط شوق سے

تڑپ گیا۔ زبان سے بے اختیار نکلا۔

بوئے خوشِ تو ہر کہ ز بادِ صبا شنید

از یار آشنا سخنِ آشنا شنید

زیب نامہ صرف ایک سطر تھی مگر ایک دفتر محبت اس میں

بھرا ہوا تھا، محبت نہ ہو تو شکوۂ ناآشنائی کیوں ہو، جو شکوہ

خبرِ محبت دے اس پر سو شکر قربان۔

ارشاد ہے۔ ترا چہ شد۔ سُنئے۔ چہ شد۔ جب سے سابق

روح پرور مراسلت نذر تفرقہ ہوئی دل اس تمنا سے لبریز

رہا کہ پھر آغاز پذیر ہوتی ؎

ہمہ شب دریں اُمیدم کہ نسیم صبح گاہی به پیام آشنائے بنوازد آشنا را

اس تمنا میں نقل و حرکت گرامی کو دیکھتا رہا جو پائے موقع رہا۔ ایک اتفاق۔ حیدر آباد سے واپسی میں واردھا اسٹیشن پر اس وقت پہنچا کہ دس منٹ پہلے تشریف بری ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر سید محمود برسوں میں ملے، پھر بھی دل اثر اخلاص سے بدستور ترم و گرم تھے۔ ملے اور خوب ملے بڑی جاں فزا اور روح پرور صحبت رہی ؎

ہر جا کہ من و دوست بہم باز رسیدیم
از بیم بد اندیش لبِ خویش گزیدیم
بے واسطۂ گوش و لب از راہ دل و چشم
بسیار سخن بود کہ گفتیم و شنیدیم

باز آیم بہ مطلب۔ شکر ہے کہ بالآخر نظر آشنائے توجہ ہوئی۔ نصف مکالمت کا موقعہ ہاتھ آیا۔ اتفاقاً جس وقت ڈاک ملی ایک عزیز کی تقریب میں جا رہا تھا ڈاک بدستور رکھ گیا۔ واپس آ کر شب کو کھولی پڑھی شکوۂ نا آشنائی نے کیا کہوں کیا لطف دیا، کس زبان سے کہوں کس قلم سے لکھوں۔ زیب نامہ

شعر بار بار پڑھا۔ ہر بار تازہ لطف پایا، ارادہ کیا صبح جواب لکھوں گا، نصف ملاقات کا سرور حاصل ہوگا۔ اسی سرور میں آمادۂ خواب ہوا۔ آمدِ خواب کے کیف میں جانبِ نیشاپور سے آواز آئی ؎

شبِ اُمید بہ از صبحِ عیدے گزرد
کہ آشنا بتمنائے آشنا خفتہ است

کیف دوبالا ہوگیا۔ شب کو جب آنکھ کھلی یہی آوازِ جاں نواز رہی، بیداری بھی خواب کی طرح شیریں رہی۔
ارشاد ہے، لمی پرسی حقیقت سنج محبت عرفی شیرازی نے جس کے آشنا سنج ہونے کی قسم کھائی ہو وہ نہ پوچھے کیوں کر ممکن ہے ؎

بنامِ آں حبیبِ آشنا سنج
کہ در آرائشِ معمورۂ رنج

جیسا اوپر عرض کیا۔ صرف انتظار موقع تھا۔ حافظ کا یہ شعر وردِ زبان ؎

ہمہ شب دریں امیدم کہ نسیم صبح گاہی
بہ پیام آشنائے بنواز د آشنا را

شکر ہے موقعہ آیا۔ شکوہ ناآشنائی ہوا، بروقت ہوا اور بجا ہوا۔ زندہ یاد آزاد۔ "الشئ بالشئ یذکر" اس دوران میں اعظم گڈھ سے مسودہ حیات شبلی کے اجزا آتے رہے پڑھتا رہا بھیجتا رہا۔ بے مبالغہ بیک وقت بیسیوں صفحے پڑھے۔ جب رکھے حسرت رہی کہ اور پڑھے ہوتے سرگذشت کا لطف حکایت نے دیا ؎

ہے آج جو سرگذشت اپنی
کل اس کی حکائتیں بنیں گی

دل محسوس کرتا تھا کہ علامہ کی صحبت میں حاضر ہوں، لطف صحبت سے مستفید، فیض یاب ہوں۔ آہ کیا صحبت تھی کیا فیض تھا۔ فخر اس میں تھا کہ ہر موقعہ پر ایک نیازمند حاضرِ خدمت آتا تھا۔ شبلی و شروانی کی زندگی کچھ اس طرح منوط رہی کہ جہاں علامہ کا فضل نور

افشاں ہے وہاں شروانی کی نادانی بھی جلوہ بیز ہے۔
والسّلام ختم الکلام۔

نیازنشان
حبیب الرحمٰن

۱۹ اے بالی گنج سرکلر روڈ۔ کلکتہ
۴؍ مارچ ۱۹۴۲ء

صدیق مکرم۔ میرے ایک نالۂ درد نے آپ کے دل محبت نواز کو ایسا ہلا دیا کہ چار صفحوں کا صحیفۂ الطاف و محبت زیبِ رقم ہوا۔ شاد کام و منت گزار ہوں۔

یک بار نالہ کردہ ام از دردِ اشتیاق
از شش جہت ہنوز صدائے نواں شنید

آپ جانتے ہیں صبح کی چائے کے بارہ میں میرا حال وہی ہے۔ جو حاجی محمد جان قدسی کا تھا۔

ساقی بہ صبوحی نفسے پیشتر از صبح
برخیز کہ تا صبح شدن تاب نہ دارم

سفر ہو، حضر ہو، کوئی حالت ہو، اس معمول میں فرق نہیں پڑتا۔ گویا شب و روز کے چوبیس گھنٹوں میں سے صرف یہی ایک وقت میرے حصہ میں آیا ہے۔ قید خانے کی زندگی ایسی ہوتی

ہے کہ قدرتی طور پر زندگی کی تمام معمولات درہم برہم
ہو جاتی ہیں میں وہاں پہنچتا ہوں تو انتظار نہیں کرتا کہ تبدیلیاں
اپنا تقاضہ شروع کریں۔ خود بدل جاتا ہوں اور کوشش
کرتا ہوں کہ وہاں کی تبدیلیوں کا پوری طرح ساتھ دوں۔
لیکن صرف ایک چیز اس سے مستثنیٰ ہوتی ہے صبح چار بجے
کی چائے۔ یہ کمبخت وہاں بھی نہیں چھوٹتی۔

لذتِ معصیتِ عشق نہ پوچھ
خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی

نینی سینٹرل جیل میں برابر یہ معمول رہا کہ صبح تین بجے اُٹھتا،
پانی کی کیتلی اسٹو پر رکھ دیتا اور غسل کے لیئے چلا جاتا، واپس
آتا تو پانی اُبل اُبل کر اپنی تیاری کا اعلان کرتا، بلا توقف
چائدانی میں چائے دم دیتا اور پھر جام و صراحی کی صحبت
میں بیٹھ کر دنیا و مافیہا کو فراموش کر دیتا۔

حاصلِ کارگہِ کون و مکاں ایں ہمہ نیست
بادہ پیش آر کہ اسبابِ جہاں ایں ہمہ نیست

پنج روزے کہ دریں مرحلہ مہلت داریم
خوش بیاسائی زمانے کہ زماں ایں ہمہ نیست

اس عالم میں کئی بار آپ کی یاد بھی آئی اور بے اختیار آئی۔

اے نسیم سحری یاد دہش عہد قدیم

ایک مرتبہ خیال ہوا۔ آپ کو کچھ لکھوں آپ کے آخری خط کے جواب کا قرض بھی باقی تھا، لیکن پھر غور کیا تو نینی سینٹرل جیل اور حبیب گنج کی باہمی مسافت اتنی دور دراز کی مسافت دکھائی دی کہ ہمت نہیں پڑی۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو امام مسلم نے مقدمہ میں عبداللہ بن مبارک کا قول حجاج بن دینار کے رفع کی نسبت نقل کیا ہے۔ "بینہما مفاوز تنقطع فیہا اعناق المطی"۔ ایسی ہی مسافت میں نے بھی دیکھی کہ سامنے ہے۔

قلل الجبال ومن دونہن حیوف

رہائی کے بعد حالات نے دم لینے کی مہلت نہ دی۔ صحت بھی تغافل کرتی رہی، لیکن جب پچھلے سفر میں لاہور سے لوٹتے ہوئے دہلی ٹھیرا تو دہلی کی پچھلی صحبتوں کی یاد کے ساتھ آپ کی

یاد بھی آئی اور اس طرح آئی کہ ضبط نہ کر سکا دل کی صدائے
درد زبان تک پہنچی اور زبان نے نوک قلم کے حوالہ کیا۔

ترا چہ شد کہ نمی پرسی آشنائے را

وہی صبح چار بجے کا وقت تھا۔ آصف علی صاحب کی کوٹھی
کے ایک کمرے میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ یکایک حکیم صاحب
مرحوم کی یاد تازہ ہوگئی۔ ان کی یاد دہلی کے ساتھ اس طرح
وابستہ ہوگئی ہے کہ یہ لفظ بغیر انھیں یاد کئے نہیں بول سکتا۔
دل کے بہت زخم ہیں جو امتدادِ زمانہ سے داغ بنکر رہ گئے
ہیں۔ ع

اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں پہلے درد تھا

لیکن یہ زخم اب تک نہ بھر سکا۔

جوشید خون تازہ ز داغ کہن مرا

پھر ان کی یاد کے ساتھ وہ تمام صحبتیں ایک ایک کرکے
سامنے آگئیں جو ان کے دم سے گرم رہا کرتی تھیں اور وہ
تمام حریفانِ محفل جو ان صحبتوں میں ہم نفس و ہم آہنگ رہا

کرتے تھے۔ ایک پوری مجلس نگاہوں کے سامنے پھر رہی تھی۔

مجنوں بہ ریگ بادیہ غم ہائے خود شمرد
یادِ زمانہ کہ غمِ دل حساب داشت

غم صرف اسی کا نہیں ہے کہ یہ لوگ جدا ہو گئے۔ غم اس کا ہے کہ وہ دنیا ہی مٹ گئی جس دنیا کی یہ لوگ مخلوق تھے اب نہ وہ دنیا واپس آسکتی ہے نہ وہ صورتیں اور سیرتیں پیدا ہو سکتی ہیں ہم اس کارواں رفتہ کے چند پس ماندگان رہ گئے ہیں جنھیں نہ تو قافلہ کا سراغ ملتا ہے نہ منزل سے آشنا ہو سکتے ہیں، نہ ہمیں کوئی پہچانتا ہے نہ ہم کسی کے شناسا ہیں۔

سراغِ یک نگاہِ آشنا در کس نمی یابم
جہاں چوں نرگستانِ بے تو چشمِ کورے باشد

کیا عرض کروں وردھا کے اسٹیشن پر ملاقات نہ ہو سکنے کا کس درجہ افسوس ہوا۔ آج کل نظم ونسق کا سارا کارخانہ درہم برہم ہو رہا ہے کوئی ٹرین وقت پر نہیں پہنچتی کمبخت کلکتہ میل کو اسی دن وقت پر پہنچنا تھا۔ آپ سے ملاقات کا معاملہ میرے لئے وہی

ہو گیا ہے جو غالب کو پیش آیا تھا۔

کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں، ہو تو کیونکر ہو؟

معلوم نہیں ادھر دہلی جانے کا کوئی موقعہ نکلتا ہے یا نہیں لیکن اگر نکلے اور میں آپ کو اطلاع دوں تو کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک دو دن کے لئے آپ بھی اس خرابہ میں آنکلیں! میں نے دہلی کو خرابہ کہا حالانکہ وہاں ایک نیا شہر آباد ہو چکا ہے۔

بایک جہاں کدورت، باز ایں خرابہ جاست

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ابوالکلام

۱۹ اے بالی گنج سرکلر روڈ
کلکتہ
۱۹ر اپریل ۱۹۴۲ء

صدیق مکرم۔ پچھلے خط کے جواب سے آپ نے شاد کام نہیں فرمایا۔ مانع بخیر ہو۔

شراب لطف پرور جام می ریزی و می ترسم
کہ زود آخر شود این نشہ و من در خمار افتم

ابوالکلام

۲۴ر اپریل ۱۹۴۲ء

شراب لطف من دارم خُم اندر خُم چہ مے ترسی
نہ زود آخر شود ایں نشہ و نے در خمار افتی

مکرم حبیب صدیق حمیم ۔ السّلام علیکم و رحمۃ اللہ
۱۹ر کا لطف نامہ آگیا ۔ ﷲ الحمد ماں نع بخیر ہے ۔ سابق گرامی نامہ اور اس کا جواب دونوں برابر پیش نظر رہے ۔ آپ کی گراں مصروفیت اور اس کے سلسلہ میں مسلسل نقل و حرکت بھی سامنے تھی ۔ اس لئے مخل اوقات بننے کی جرأت نہ ہو سکی اب انشاء اللہ جواب عرض ہوگا ۔ اس وقت رفع نگرانی کے لئے یہ چند الفاظ ارسال خدمت کر رہا ہوں ۔ عافیت سامی کی دلی تمنا ہے ۔

نیاز کیش :۔ حبیب الرحمٰن

کلکتہ

۱۴ر مئی سنہ ۱۹۴۲ء

صدیق مکرم۔

حسب حالے نہ نوشتیم و شد ایامے چند

کل الہ آباد سے تھکا ماندہ واپس آیا تو طبیعت بہت بے کیف تھی حسب معمول دوپہر کو کوئی کتاب لے کر لیٹنا چاہا تو ابو طالب کلیم کا دیوان ہاتھ آگیا، کھولا تو یہ غزل نکلی!

نفس موافق طبع جہانیاں نہ کشی
بہ ہر کجا کہ تبسم خرند، شیون باش!

چو سقف خانہ ہوادار یک مقام مشو
گہے سحاب چمن، گاہ دود گلخن باش

بجز متاع تجرد بہ بار خویش مبند
بہ ہر سفر کہ روی، شرمسار رہزن باش

کیا عرض کروں طبیعت کس درجہ محفوظ ہوئی۔ ساری تھکن

مٹ گئی۔ کوئی ہم نفس نہیں جسے اس ذوق و کیف میں شریک
کروں خیال آیا کہ آپ کو زحمت التفات دوں۔ اُمید ہے
بخیر و عافیت ہوں گے۔

والسّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ابو الکلام

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی
رئیس حبیب گنج (علی گڈھ)

۱۰ مئی ۴۲ء

صدیق حبیب ۔

نامۂ وداد لطف بیز ہوا ۔ جو خط آتا ہے لطفِ تازہ لاتا ہے ۔

بہ میخانہ راہم افتادہ است
کہ ہر شیشۂ وے پری خانہ ایست

کلیم کے کلام نے سرور موفور بخشا ۔ قلمی کلیات نکلوا کر ساری غزل پڑھی ۔ بیت الغزل وہی تین شعر ہیں جو زیبِ قلم ہوئے ۔ فارسی ادب کا ذوق کھونے سے ملک نے بڑی نعمت کھو دی ۔ کیا جانفزا ادب تھا ، دیکھئے کلیم کے یہی تینوں شعر اصول زندگی ہو سکتے ہیں وہ زندگی جو کامیاب و کام بخش ہو ۔ ایک لطیفہ ہاتھ آیا ۔ حافظ شیرازی کی لسان الغیبی مسلم ہے معلوم ہوتا ہے کہ تخلص کی برکت سے کلیم نے بھی یہ فیض پایا ہے ۔ جس "گرفت" سے آپ نے حال میں نجات حاصل کی

اس کی طرف ہر شعر میں اشارے ہیں :-

نفس موافق طبع جہانیاں نہ کشی
بہ ہر کجا کہ تبسم خزندشیون باش

قہقہوں کی اور تبسم کی کیا کمی تھی۔

بجز متاع تجرد بہ بار خویش مبند
بہ ہر سفر کہ روی شرمسار رہزن باش

للہ در کلیم ۔ رحمت بر کلیم ۔ مرقع کھچ گیا۔

بجواب گرامی نامہ ۲۴ر اپریل کو کلکتہ ضراعت نامہ بھیجدیا ہے۔ حالیہ خط میں اس کا ذکر نہ دیکھنے سے واہمۂ عدم رسی ہوتا ہے۔ یہ شعر زیب قلم فرمایا گیا تھا۔

شراب لطف پر در جام مے ریزی ومن ترسم
کہ زود آخر شود این نشۂ ومن در خمار افتم

جواب بداہتہً تصرف کر کے عرض کیا تھا۔

شراب لطف من دارم خُم اندر خُم چہ مے ترسی
نہ زود آخر شود ایں نشہ وُنے در خمار اُفتی

ایک روز کمال خجندی کا کلیات ہاتھ میں آگیا۔ دیکھا، پڑھا، دو شعر دلنواز بلکہ دلنشین ہوئے۔ عرض کروں۔

کمال از کعبہ رفتی بر در یار	ہزارت آفریں مردانہ رفتی
بہ کوئش آمدن ای دل ترا ساخت	کہ ہشیار آمدی دیوانہ رفتی

ہزارت آفریں اے کمال! اس روز سے کتنی بار دونوں شعر پڑھتا ہوں اور جانِ تازہ کا لطف پاتا ہوں۔

للہ الحمد بخیر و آرزومندِ عافیت احباب ہوں۔ والسلام ختم الکلام۔

نیاز کیش حبیب الرحمٰن

۱۹ اے بالی گنج سرکلر روڈ
کلکتہ
۶ مئی سنہ ۱۹۴۲ء

صدیق مکرم۔ نامۂ گرامی کے لئے شکر گذار ہوں

قلیل منك یکفینی ولاکن
قلیلك لا یقال لہٗ قلیل

ابوالکلام

مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی
رئیس۔ حبیب گنج۔ علی گڈھ

کلکتہ

۲۰ جون ۱۹۴۲ء

صدیق مکرم۔ ایک بات دریافت طلب ہے۔
محمد شاہی عہد میں آنند رام مخلص تھا۔ وزیر قمر الدین کا وکیل اور سراج الدین علی خاں آرزو اور شمس الدین فقیر کا ہم صحبت۔ اس نے ایک کتاب مرآۃ المصطلحات لکھی ہے۔ اس کا ایک نسخہ مجھے ملا ہے۔ معلوم یہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ کتاب کبھی چھپی ہے یا نہیں اگر آپ کی نظر سے مطبوعہ نسخہ گذرا ہو تو مطلع فرمایئے۔
امید ہے بخیر و عافیت ہوں گے۔ والسّلام علیکم

ابوالکلام

جناب مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی
حبیب گنج بھیکم پور۔ علی گڑھ

وبیرانگل لاج ۔ شملہ
۲۷ر جون ۱۹۴۵ء

صدیق مکرم ۔

اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشین دل
می بینمت عیاں و دعا می فرستمت

ابوالکلام

یکم جولائی ۱۹۴۵ء

صدیق حبیب

جس دن بدرِ کامل گہن سے نکلا تھا دل نے شہادت دی کہ نورِ محبت جان نواز ہوگا۔ ہوا اور کس شان سے۔ ۲۷ر جون کو پہاڑ کی چوٹیوں کا ہنگامہ ایک گروپ کے رنگ میں نظر آیا۔ اُس میں ایک پیکرِ محبوب بھی تھی قینچی لی مجمعِ اغیار سے جدا کیا۔ دیکھا شیراز کی طرف سے صدا آئی۔

روشن از پرتو رویت نظرے نیست کہ نیست
منتِ خاکِ درت بر بصرے نیست کہ نیست

اس غزل کا ایک اور شعر شاید بے موقع نہ ہو ؂

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در محفلِ رنداں خبرے نیست کہ نیست

خیر یہ شیراز کا ترانہ تھا۔ کان لگاتا ہوں تو شملہ سے دوسرا ترانہ

سامعہ نواز ہوتا ہے۔

اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشینِ دل
می بینمت عیاں و دعا می فرستمت

جو کانوں نے سنا تیسرے روز نقوشِ دلفروزی کے پردے میں آنکھوں نے دیکھ لیا۔

اجازت ہو تو دوسرا مصرع یوں بھی لکھ دوں۔

می بینمت عیاں و دعا می فرستمت

حبیب الرحمٰن

ویسرائگل لاج - شملہ
۶ر جولائی ۱۹۴۵ء

صدیق مکرم - نامہ گرامی پہنچا -

گرچہ دوریم بیادِ تو قدح می نوشیم
بُعدِ منزل نہ بود در سفرِ روحانی

دل حکایتوں سے لبریز ہے مگر زبانِ درماندہ کو ابھی یارائے سخن نہیں۔ منتظرِ مہلت ہوں۔

ابوالکلام

وبیرانگل لاج۔ شملہ
۹ جولائی ۱۹۴۵ء

صدیق مکرم۔ نامہ تعزیت کے لئے شکر گذار ہوں۔
ایک زخم ہو تو اس کا مرہم ڈھونڈھوں اب تو دل
سرتاسر زخم ہو چکا۔

پیش ازیں صد داغ بر دل داشتم اکنوں یکیست

ملا صاحب کی تعزیت کے لئے بھی شکر گذار ہوں۔

ابوالکلام

بہ مولنا ابوالکلام آزاد بہنگام ورود ایشان برگل مرغ کشمیر

محو نظارۂ گل مرغ نگارے دارم
کز خیالش بہ دل زار بہارے دارم

اے نسیم سحری گر بہ حضورش گذری
غنچہ شوق کہ در جان فگارے دارم

ور بپرسد کہ مگر شوق پیامے دارد
سر فرود آر و زمن گوی کہ آرے دارم

دو دستاں را نعمت یاد کردن ہمت است
ورنہ ہر نخلے بپائے خویش افشاند ثمر

اسیر آزاد حبیب

۵ رمضان المبارک ۱۳۶۴ھ۔ مطابق ۱۴ جولائی ۱۹۴۵ء

نسیم باغ - سرینگر (کشمیر)
۲۶ر اگست ۱۹۴۵ء

صدیق مکرم - زندگی میں بہت سی جستجوئیں کی تھیں لیکن اب ایک نئی جستجو پیچھے لگ گئی ہے - یعنی اپنی گم شدہ صحت کا سراغ ڈھونڈھ رہا ہوں -

نکل گئی ہے وہ کوسوں دیارِ حرماں سے!

اطباء نے کشمیر کی وادیوں میں سراغ رسانی کا مشورہ دیا تھا - چنانچہ گلمرگ پہنچا اور تقریباً تین ہفتے وہاں بسر کئے لیکن گم شدہ صحت کا کوئی سراغ نہیں ملا - اب سرینگر آ گیا ہوں اور ہاؤس بوٹ میں نسیم باغ کے پاس مقیم ہوں - فیضی نے یہاں بارِ عیش کھولا تھا!

ہزار قافلۂ شوق می کند شبگیر
کہ بارِ عیش کشاید بخطۂ کشمیر

میرے حصہ میں ناخوشی و علالت کا بوجھ آیا - اسے سر پر اٹھائے

یہاں آیا تھا اور سر پہ اُٹھائے واپس جاؤں گا۔ یہ کشمیر کی جان پرور آب وہوا کا قصور نہیں ہے میرے جسم ناساز کا قصور ہے

ہر چہ ہست از قامتِ ناساز وبے اندامِ ماست
ورنہ تشریفِ تو بر بالائے کس دشوار نیست

۱۹ ار کو جب گلمبرگ سے سرینگر آرہا تھا تو راہ میں ڈاک کھولی اور آپ کا نامہ منظوم ملا۔ کیا عرض کروں کس درجہ طبیعت متاثر ہوئی۔ سرتاپا شکر گذار اور ہمہ تن رہین منت ہوں۔

قلیل منك یکفینی ولاکن
قلیلك لا یقال لہ قلیل

یہ خط آپ کے نامۂ منظوم کی رسید ہے مجھے جو کچھ لکھنا ہے اس کے لئے مہلت کا انتظار کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ ایک دو دن کے اندر کسی نہ کسی طرح وقت نکالوں گا۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

ابوالکلام

جناب مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی
حبیب گنج۔ (علیگڈھ)

نسیم باغ ۔ سرینگر
۴ر ستمبر ۱۹۴۵ء

صدیق مکرم ۔ وہی صبح چار بجے کا جانفزا وقت ہو۔ ہاؤس بوٹ مقیم ہوں۔ دہنی طرف جھیل کی وسعت شالا مار اور نشاط باغ تک پھیلی ہوئی ہے۔ بائیں طرف نسیم باغ کے چنار کے درختوں کی قطاریں دور تک چلی گئی ہیں۔ چائے پی رہا ہوں اور آپ کی یاد تازہ کر رہا ہوں۔

گرچہ دوریم، بیادِ تو قدح می نوشیم
بُعدِ منزل نہ بود در سفرِ روحانی

گرفتاری سے پہلے آخری خط جو آپ کے نام لکھ سکا تھا وہ ۹ر اگست ۱۹۴۲ء کی صبح کا تھا۔ کلکتہ سے بمبئی جا رہا تھا۔ ریل میں خط لکھ کر رکھ لیا کہ بمبئی پہنچکر اجمل خاں صاحب کے حوالہ کروں گا کہ نقل رکھ کر ڈاک میں ڈالدیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ انھوں نے نقول رکھنے پر اصرار کیا تھا لیکن بمبئی پہنچتے ہی کاموں کے ہجوم

میں اس طرح گم ہو گیا کہ خط بھیجنے کا خیال نہ رہا۔ ۹ اگست کی صبح کو جب مجھے گرفتار کر کے احمد نگر لے جا رہے تھے تو راہ میں بعض کاغذات دیکھنے کے لئے اٹاچی کیس کھولنا پڑا اور یکایک وہ خط سامنے آ گیا۔ اب دنیا سے تمام علائق منقطع ہو چکے تھے اور ممکن نہ تھا کہ خط ڈاک میں ڈالا جا سکے۔ میں نے اسے اٹاچی کیس سے نکال کر کاغذات کے ایک فائل میں رکھ دیا۔

دو بجے ہم احمد نگر پہنچ گئے۔ اور بیس منٹ کے بعد قلعہ کے اندر مقید تھے۔ اب اس دنیا میں جو قلعہ سے باہر تھی اور اس میں جو قید خانے کی چار دیواری کے اندر تھی، برسوں کی مسافت حائل ہو گئی۔

کیف الوصول الی سعاد و دونہا
قلل الجبال و بینہن خیوف

دوسرے دن یعنی ۱۰ اگست کو حسب معمول صبح تین بجے اٹھا، چائے کا سامان جو سفر میں ساتھ رہتا ہے وہاں بھی سامان کے ساتھ آ گیا تھا۔ چائے دم دی۔ فنجان سامنے رکھا اور اپنے

خیالات میں ڈوب گیا۔ خیالات مختلف گوشوں میں بھٹکنے لگے
تھے۔ اچانک وہ خط جو ۴ ر اگست کو ریل میں لکھا تھا اور کاغذات
میں پڑا تھا سامنے آگیا۔ بے اختیار خواہش پیدا ہوئی کہ کچھ
دیر آپ کی مخاطبت میں بسر کروں اور آپ سُن رہے ہوں یا نہ سُن
رہے ہوں۔ مگر روئے سخن آپ کی طرف پھیر دوں۔ چنانچہ اس عالم
میں ایک مکتوب قلمبند ہوگیا۔ پھر اس کے بعد ہر دوسرے تیسرے دن
مختلف مکتوبات قلمبند ہوتے رہے۔ آگے چل کر بعض دوسرے
احباب واعزہ کی یاد بھی سامنے آتی رہی اور ان کی مخاطبت
میں بھی گاہ گاہ بزمِ سخن آراستہ ہوتی رہی۔ قید خانہ سے باہر
کی دنیا سے علائق یک قلم قطع ہوچکے تھے۔ کچھ معلوم نہ تھا کہ یہ
مکتوبات کبھی مکتوب الیہم تک پہنچ بھی سکیں گے یا نہیں۔
تاہم ذوقِ مخاطبت کی طلب گاریوں نے کچھ ایسا مجبور کر دیا تھا کہ
قلم اٹھا لیتا تو پھر رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ لوگوں نے نامہ بری
کا کام قاصدوں سے لیا ہے۔ میرے حصّہ میں عنقا آیا۔

ح

این رسم و راہ تازہ زحرمانِ عہد ماست
عنقا بروزگار کسے نامہ بر نہ بود

۱۰ اگست ۴۲ء سے مئی ۱۹۴۳ء کے اواخر تک ان کا سلسلہ بلا انقطاع جاری رہا تھا لیکن اس کے بعد رُک گیا۔ کیونکہ ۹ اپریل ۱۹۴۳ء کے حادثہ[۵۱] کے بعد طبع واماندۂ حال بھی رُک گئی تھی اور اپنی درماندگیوں میں گم تھی۔ اس زمانہ میں بعض مصنفات کی تحریر کا کام بدستور اپنے مقررہ اوقات میں ہوتا رہا اور جو معمولات قلعہ احمد نگر کی زندگی میں قرار پاگئے تھے ان میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ تاہم یہ حقیقت حال چھپائی نہیں چاہتا کہ یہ جو کچھ بھی قرار و سکون کی حالت تھی جسم و صورت کی تھی، قلب و روح کی نہ تھی۔ جسم کو میں نے ہلنے سے بچا لیا تھا مگر دل کو نہیں بچا سکتا تھا۔

دلے دیوانۂ دارم کہ در صحراست پنداری!

سلہ ۵۱ رحلتِ شریک حیات ۱۲۔ شاہد شروانی۔

اس کے بعد بھی گاہ گاہ واقعات کی تحریک کام کرتی رہی اور رشتۂ فکر کی گرہیں کھلتی رہیں تاہم سلسلۂ کتابت کی وہ تیز رفتاری قایم نہ رہی جو اوائل میں ساتھ دیتی رہی تھی۔ اپریل ۱۹۴۵ء میں جب احمد نگر سے بانکوڑا میں قید تبدیل کردی گئی تو طبیعت کی آمادگیوں نے بالکل جواب دیدیا تھا۔ بانکوڑا میں صرف بعض مصنفات کی تکمیل کا کام جاری رکھا جاسکا اور کسی بات کی طرف طبیعت متوجہ نہ ہوسکی۔ آخری مکتوب جو بعض سیاسی مسائل و حالات کی نسبت ایک عزیز کے نام قلمبند ہوا۔ ۳ مارچ ۱۹۴۵ء کا ہے۔ اُس پر یہ داستانِ بے ستون و کوہ کن ختم ہو جاتی ہے اگرچہ زندگی ابھی تک ختم نہیں ہوئی ہے۔

شمّہ از داستانِ عشق شور انگیز ماست
ایں حکایتہا کہ از فرہاد و شیریں کردہ اند

غور کیجیے تو انسان کی زندگی اور اس کے احساسات کا بھی کچھ عجیب حال ہے تین برس ہوں، یا تین دن، تین گھنٹے ہوں

یا تین لمحے لیکن جب گذرنے پر آتے ہیں تو گذر ہی جاتے ہیں۔

زیں ہوسہا بگذر یا نہ گذر، می گذرد!

رہائی کے بعد جب ۲۱ر جون کو کلکتہ سے بمبئی آیا اور اسی دوست کے یہاں اسی کمرہ میں ٹھیرا جہاں تین برس پہلے اگست ۱۹۴۲ء میں ٹھیرا تھا تو یقین کیجئے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ۹ر اگست ۱۹۴۲ء کا سارا ماجرا کل کی بات تھی اور یہ پورا زمانہ ایک صبح شام سے زیادہ نہ تھا۔ حیران تھا کہ جو کچھ گذر چکا وہ خواب تھا یا جو کچھ اب دیکھ رہا ہوں یہ خواب ہے۔

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

جس دن بانکوڑا میں رہا ہوا تھا یہ تمام مکتوبات نکالے تھے اور ایک فائل میں بہ ترتیب تاریخ جمع کر دئے تھے خیال تھا کہ انھیں نقل کرنے کے لئے دیدوں گا اور پھر اصل آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا لیکن شملہ میں بعض احباب کی نظر سے بعض مکاتیب گذرے تو وہ مصر ہوئے کہ انھیں بلا تاخیر

طباعت کے لئے دیدوں۔ چنانچہ اب ایک خوش نویس مراد آباد میں ان کی کتابت کر رہے ہیں اور تمام مسودات ان ہی کے پاس ہیں۔ انشاءاللہ عنقریب وہ ایک رسالہ کی صورت میں شائع ہوجائیں گے اور میں قلمی مکاتیب کی جگہ مطبوعہ مکاتیب کا نسخہ آپ کی خدمت میں بھیجوں گا۔ اس سلسلہ کا پہلا مکتوب شملہ میں ایڈیٹر صاحب اخبار مدینہ نے اجمل خاں صاحب سے لے لیا تھا جو اخبارات میں شائع ہوچکا ہے شاید آپ کی نظر سے گذرا ہو۔ "صدیق مکرم" کے تخاطب سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ روئے سخن آپ ہی کی طرف تھا،

چشم سوئے فلک و روئے سخن سوئے تو بود

مکتوبات کے دو حصے کر دئے ہیں۔ غیر سیاسی اور سیاسی ابھی پہلے حصے کی کتابت ہو رہی ہے۔ اس کے تمام مکاتیب بلا استثنا آپ کے نام ہیں۔

پرسوں ۷ کو یہاں سے دہلی جا رہا ہوں۔ چونکہ امریکن دوستوں کی عنایت سے ہوائی جہاز کا انتظام ہوگیا ہے

اس لئے ڈھائی گھنٹے میں دہلی پہنچ جاؤں گا اور پھر عید وہاں
کرکے بمبئی کا قصد کروں گا۔ ۸ار سے ۲۴ر تک وہیں قیام
رہے گا۔

ابوالکلام

جناب مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی
حبیب گنج۔ ضلع علی گڈھ

۴ مئی ۱۹۴۶ء

غبار راہ گشتم، سرمہ گشتم، تو تیا گشتم
بچندیں راہ گشتم تا بچشمت آشنا گشتم

صدیق حبیب بہ دل قریب۔
اس روز لکھنؤ میں نظارۂ جمال اگرچہ ع
"خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود"
کا مصداق تھا تاہم دل میں گرمیٔ شوق پیدا کرنے میں کامیاب تھا۔ دن[1] بھر مکرر شوقِ لقا کی تمنا رہی۔ شب کو دوبارہ ٹیلیفون کیا، مگر ہجوم مشاغلِ سامی، باریابی میں حارج رہا۔ تقاضائے شوق تھا کہ چند ساعتیں لطف صحبت بخشیں۔ دور چار ہو ایک تازہ مضمون گوش گذار کروں مگر دل کی تمنا دل میں رہی۔

---

[1] دن کے بجائے دل قلم سے نکل گیا اس پر نواب صاحب نے یہ نوٹ دیا " دیکھیئے گرمی شوق کا اثر "دن" کی بجائے قلم سے "دل" نکلا" شاہد شروانی

اسی عرصے میں دو نسخے "غبارِ خاطر" کے نورافزا ہوئے۔ غبار اور نورافزائی! ہاں! نورافزائی غبار تھا کوئے دوست کا۔ آنکھوں سے لگایا، پڑھا، پڑھوں گا، زہے قسمت کہ گوشۂ تنہائی میں انیسِ صحبت حبیب رہا، بزم انس اس قدر طویل کہ ایک مجلد کا سامان تھی۔ میرا خیال ہے کہ یہ واقعہ تاریخی واقعہ بنے گا۔

"شکرِ نعمتہائے تو چنداں کہ نعمتہائے تو"

باز آیم بر سرِ مطلب۔ تازہ مضمون یہ تھا۔

شکر للہ کہ بروے تو قدح می نوشیم
جلوۂ قرب نمودہ سفرِ جسمانی

(حسرت شیروانی)

گرچہ دوریم بیادِ تو قدح می نوشیم
بُعدِ منزل نبود در سفرِ روحانی

ہی ابھی غالب ہے۔

تمنا تھی کہ چائے کا پیالہ ہاتھ میں یہ مضمون زبان پر ہوتا

خیر وہ تمنا پوری نہ ہوئی تو تحریر کے ذریعے سے سنا دیا۔
کبھی انشاء اللہ تمنائے لقا بھی حاصل ہو جائے گی۔
آجکل کی آپ کی مصروفیتیں قلم کو روک رہی ہیں اس
لئے ختم کلام۔ والسّلام ختم الکلام۔

نیاز نشان
حبیب الرحمٰن

اجمل خاں صاحب مکرم
اوّل تعمیل ارشاد ہوئی۔ اس کے بعد مطالعہ۔
دونوں نسخے صحیح کر لئے گئے۔

شملہ
۱۱ رمئی ۱۹۴۶ء

صدیق مکرم -
نامۂ گرامی کے لئے شکریہ - جونہی مہلت ملی -
مخاطبت کی خوش وقتی حاصل کروں گا - والسّلام علیکم

ابوالکلام

جناب مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی
رئیس - حبیب گنج - ضلع علی گڈھ

کاروانِ خیال کا پروف تیار ہو چکا تھا کہ مراسلت کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ جی چاہا کہ ان خطوط کو بھی شاملِ مکاتیب کر دیا جائے۔ نواب صدر یار جنگ بہادر نے میری گذارش پر یہ خطوط بھی عنایت فرما دئے۔ مولانا آزاد کا مرسلہ "تحفہ" وہائٹ جیسمین" کاٹین عیدالاضحیٰ کی صبح کو نواب صاحب کو وصول ہوا۔ نواب صاحب کے آخری خط میں جس مجلسِ چارنوشی کا ذکر ہے۔ اس میں اپنی خوش بختی سے میں بھی شریک تھا۔ بلکہ اس مجلس کا انعقاد ہی مجھ پر کرمِ بے پایاں کا ثبوت تھا۔ لطف و اتفاق کی بات یہ ہے کہ نواب صاحب ہم رنگِ چار مخملی ٹوپی زیب فرق فرمائے ہوئے تھے، اس منظر کے ساتھ دلگیر اکبرآبادی مرحوم کا یہ شعر بے ساختہ زبان پر آگیا۔

عکس جمالِ یار ہے جام شراب میں ‏ ‏ ‏ اک آفتاب اور بھی ہے آفتاب میں

(کلاہ)

یکم نومبر ۱۹۴۶ء ‏ ‏ ‏ شاہد شروانی

مسوری

ار جون ۱۹۴۶ء

صدیقِ مکرم، آپ کا ہر مکتوب پڑھ کر خوشی ہوتی ہے مگر آخری مکتوب پڑھ کر خصوصیت کے ساتھ طبیعت مسرور ہوئی۔ اول تو اس لئے کہ آپ نے ایک چیز کی فرمائش کی، پھر فرمائش بھی کی تو ایسی چیز کی جس سے اشتراکِ ذوق کا رشتہ اور زیادہ استوار ہو گیا یعنی چینی چائے کی:

دوائے دردِ دلِ خود ازاں مفرح جوئے
کہ در صراحیِ چینی و شیشۂ حلبی ست

مگر سوئے اتفاق دیکھئے کہ

آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

وہائٹ جیسمین چائے ختم ہو چکی ہے اور اس کی جگہ ایک دوسری چینی چائے سے کام لے رہا ہوں جو کلکتہ کے ایک چینی دوست نے بھیجی تھی۔ سفر میں جس قدر ساتھ تھی اس کے دو حصّے

کئے ایک حصّہ رکھ لیا ایک حصہ مرسل خدمت ہے۔ شرمندہ ہوں کہ اس قلیل مقدار سے زیادہ اس وقت نہ بھیج سکا۔

زاہد از با خوشۂ تاکے بچشم کم مبیں
ہیں نمی دانی کہ یک پیمانہ نقصان کردہ ام

وہائٹ جیسمین امید ہے کہ ۱۵۔ جون تک کلکتہ پہنچ جائے چار ڈبوں کی توقع ہے۔ دو ڈبّے بلا تاخیر مرسل خدمت ہوں گے۔ کلکتہ اطلاع دے رہا ہوں تاکہ براہ راست روانہ کر دیئے جائیں۔

اعلیٰ درجہ کی سبز چائے بھی آجکل نہیں ملتی وہ بھی منگوائی ہے اگر آگئی تو اس میں بھی آپ شریک مساوی ہوں گے۔

جو چائے بھیج رہا ہوں یہ بھی بری نہیں ہے۔ لیکن وہائٹ جیسمین کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کی بہت کم مقدار چائے دانی میں ڈالنی چاہیئے ورنہ تلخ ہو جائے گی۔ نیز ضروری ہے کہ کم از کم پانچ منٹ تک توقف کیا جائے۔ میں دس منٹ تک انتظار کرتا ہوں۔

ابوالکلام

دہلی

۱۔ نومبر ۱۹۴۶ء

صدیق مکرم، سید نظیر حسین، والا نامہ لیکر آئے جو کچھ ان کے لئے کر سکتا تھا کر چکا ہوں، امید ہے کہ سود مند ہوگا عرصہ ہوا مسوری میں آپ کا ایک والا نامہ ملا تھا جس میں وہائٹ جیسمین چائے کی فرمائش تھی۔ اس وقت میں خود تشنہ لب تھا اس لئے عذر خواہ ہوا۔ اور ایک دوسری چینی چائے بطور نمونہ کے بھجوا دی۔ اب وہائٹ جیسمین کا ایک ڈبا آگیا ہے۔ اس میں سے تھوڑی سی یہاں رکھ لی ہے۔ باقی روانۂ خدمت کرتا ہوں امید ہے کہ پسند خاطر ہو۔

مے خور بشعر بندہ کہ دل تنگیت میاد

بعد از تو خاک بر سر اسباب دنیوی

بہت جی چاہتا ہے کہ یکجائی کی صورت نکلے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ ادھر قصد کر رہا ہوں کہ کچھ عرصے دہرہ دون

میں قیام کروں۔ کیونکہ صحت جواب دے رہی ہے۔ اور ڈاکٹروں
کا تقاضا ہے کہ دو تین ہفتے سکون خاطر کے ضرور نکالوں۔ کاش
ایسا ہو سکتا کہ آپ دو چار دن کے لئے دہرہ دون تشریف
لا سکتے۔ اور میرے ساتھ قیام فرماتے۔

فرخندہ شبے باید و خوش مہتابے
تا با تو شکایت کنم از ہر بابے

امید ہے مزاج گرامی بعافیت ہو گا۔

مخلصکم الوفی
ابوالکلام

حبیب گنج ضلع علیگڈھ

۱۷ رذی الحجۃ الحرام ۱۳۶۵ھ

"صدیقِ مکرم" کے مکرم باکرامت، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
اوّل تبریکِ عید پیش کروں۔ اپنے استاذ الاساتذ مولانا سید حسین شاہ
صاحب واصف بخاری مرحوم کی ایک برجستہ رباعی سناؤں ؎

غم زہر سینہ بعید است کہ عید است امروز
زہ! چہ روزِ خوش و میمون و سعید است امروز
ترک تازِ الم و شامِ غم و صبحِ طرب
آرمید است و رمید است و دمید است امروز

اس کے بعد شکریہ یاد فرمائی ادا کروں۔ لفافہ انگریزی میں تھا۔
معمولی تحریر خیال کی کھولنے کو لوٹا تو اسم گرامی مرقوم تھا۔
جنبشِ شوق کے ساتھ کھولا۔ نقوشِ تاباں دیدہ افروز و دلنواز
ہوئے۔

چا رخطائی کی آمد کا مژدہ پڑھا۔ دل چاہا کہ چائے پی لوں تب

شکرانہ کرامت پیش کروں۔ چاء آئی۔ کیا خوب آئی، پی۔ دل نے گرمیٔ محبت کے ساتھ وادیٔ خطا کی سیر کا لطف حاصل کیا۔

ایک زمانے کی سنی ہوئی رباعی ایرانی شاعر کی نوشتہ یاد آئی۔

اے چائے چہ گویمت چہائی | در عالم جسم کیمیائی
دریا کی طینتت خطا نیست | ہر چند کہ زادۂ خطائی

اس سلسلے میں ایک عجیب حسنِ اتفاق ہے۔ جبکہ آپ کی چاء کی فنجان سے ہاتھ گرم ہوا اردو کا ایک رسالہ کھول کر پڑھا سرِ آغاز "عنبریں چاء" کے عنوان سے ایک نوٹ نظر آیا۔ گویا آپ کی اور آپ کی چاء کی تصویر تھی کمال تصور یہ کہ سطرِ آخر لفظ آزاد سے مزین ہے، تراشہ ہنوز دِنامہ شوق کرتا ہوں۔ کششِ شوق اس سے بھی بڑھ کر کرشمے دکھاتی ہے۔

دو الطاف نامے سامنے ہیں۔ ایک میں آمدِ چاء کی خبر ہے دوسرے میں قدومِ دہرہ دون کی۔ اس کے ساتھ مخلص کی یاد فرمائی۔ یقین کیجیے دل مسرتِ شوق سے تڑپ گیا۔ آیئے آیئے۔ انشاء اللہ تعالیٰ لطفِ ہمدلی و ہمنشینی حاصل ہوگا، ملا جی بھی ساتھ

ہوں گے۔ خبر سنکر ابھی سے دو بجے رات کو دودھ لانے کا سودا
پکار رہے ہیں۔
ماشاء اللہ کیا پر لطف وقت ہوگا جبکہ۔

گرچہ دوریم بہ یادِ تو قدح می نوشیم
بُعدِ منزل نہ بود در سفرِ روحانی

کے جواب میں اپنا ایک شعر عرض کروں گا۔

شکر للہ ابروئے تو قدح می نوشیم
جلوۂ قرب نمودہ سفرِ جسمانی

آپ کی صحت صرف آپ کی ملکیت نہیں ہے ملک و ملت
برابر کے بلکہ شریک غالب ہیں، ایک با اخلاص مخلص بھی، لہذا
اس کی حفاظت کی خاطر سے آرام کیجئے۔ دہرہ کا سفر کیجئے مخلص
کی یاد فرمائی ہو۔ الحمد للہ تعالیٰ کہ عافیت سے ہوں۔ آپ کی
صحت و عافیت کا دل سے متمنی۔ والسّلام ختم الکلام۔

نیاز نشان
حبیب الرحمٰن

عنبریں چاء

یوں تو وقت پر ہر چائے مزا دیتی ہے لیکن جو لطف جو کیف اور جوہستی (سفید چمیلی) اور عنبریں چائے میں ہے وہ بات کچے گھڑے والی کو کہاں نصیب، صبح کے وقت کیتلی سامنے ہو اور اگر دم دیتے بن پڑے تو ایسا (لون) پیدا ہو کہ ارغوانی کو انسان بھول جائے۔ اور پھر کوئی رنگ نظر میں نہ سمائے کیتلی سے فنجان میں آئے معلوم ہو کہ شیشے میں پری اُتر آئی اور اگر ایک جُرعہ حلق سے نیچے اُتر جائے تو ہر گرفتار آزاد بن جائے۔

